بانی : حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

مدیر : خالد سیف اللہ رحمانی

سہ ماہی مجلہ بحث ونظر حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۱۳۵-۱۳۶ / ۳۵-۳۶	جنوری — جون ۲۰۲۴ء	جمادی الثانی — ذوالقعدہ ۱۴۴۵ھ

مدیر

خالد سیف اللہ رحمانی

زرِتعاون

اندرون ملک

ایک شمارہ:50روپے

سالانہ:180، بذریعہ رجسٹری:220

سہ سالہ:500، بذریعہ رجسٹری:600

بیرونِ ملک

ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ:20امریکی ڈالر

یورپ، امریکہ، افریقہ کے لئے :

سالانہ:30امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony, Po:Pahadi Shareef, Hyd. T.S 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک/ڈرافٹ پر صرف:"Khalid Saifullah" لکھیں

کمپوزنگ: العلم گرافکس، حیدرآباد، فون نمبر: 8919621187

فہرست مضامین

● ● ●

افتتاحیہ

ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے تخت وتاج سے محروم ہونے کے باوجود اس ملک میں اپنی شناخت کو باقی رکھا ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اپنے مذہب سے جس درجہ کی وابستگی پائی جاتی ہے، کوئی قوم نہیں جو اپنے مذہب سے اس درجہ وابستہ ہو، اس گئی گذری حالت میں بھی مسجد کی آبادی اور رمضان المبارک کے اہتمام کو دیکھئے، زکوٰۃ وانفاق اور کثیر صرفہ کے باوجود حج وعمرہ کی ادائیگی کو سامنے رکھئے اور نکاح وطلاق وغیرہ کے مسائل میں قانون شریعت کے احترام پر نظر کیجئے تو بہ مقابلہ مسلمانوں کے دوسری اقوام میں ایک فیصد بھی اس درجہ کا اہتمام نہیں ملے گا، کسی اور قوم میں افتاء اور قضاء کے ادارے نہیں ہیں، جہاں لوگ اپنے معاملات، کاروبار اور نجی زندگی کے بارے میں بھی درست ونادرست اور حلال وحرام کے بارے میں استفسار کرتے ہوں، یہ بہرحال بحیثیت قوم کے مسلمانوں ہی کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کو اسلام سے مربوط رکھا ہے۔

ہندوستان اور دوسرے ممالک کے تئیں یہ فرق کیوں ہے؟ گذشتہ ایک صدی میں جو اسلامی تحریکات اُٹھی ہیں اور تحریکی شخصیتوں نے جنم لیا ہے، زیادہ تر ان کا منبع وسرچشمہ ہندوستان ہی ہے؛ اس لئے یہ اہم سوال ہے جو سوچنے والوں کو متوجہ کرتا ہے — اگر غور کیا جائے اور حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے تو اس کا جواب ایک ہی ہے اور وہ ہے دینی مدارس کا نظام! ہندوستان پر جوں ہی انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا اور اسلام کے خلاف سیاسی اور تبلیغی کوششیں شروع ہوئیں، تخت وتاج سے بے نیاز اور حکومت واقتدار کی حرص سے آزاد دردمند اور بلند نگاہ علماء کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ صرف منفی کوششوں سے اس طوفان کا مقابلہ ممکن نہیں، اب اسلام کی حفاظت وبقاء کے لئے مثبت تدبیر مطلوب ہے اور اس تدبیر کو انھوں نے سرکاری مداخلت سے آزاد ایسے دینی تعلیم کے نظام کی صورت میں دریافت کیا جو غریب سے غریب مسلمانوں کے گھر میں بھی علم کی شمع جلا سکے اور ہر کچے پکے گھر میں دینی تعلیم کی شعاعیں پہنچ سکیں۔

ہمارے بزرگوں نے مدارس کے اس نظام کونہایت ہی معمولی اورسادہ حالت میں رکھا،معمولی عمارتیں جو نگاہوں میں جچتی نہیں،کم تنخواہیں پانے والے مدرسین وخدام جوسیدھی سادی زندگی بسر کرتے ہوں،فقیرانہ لباس میں ملبوس طلبہ جن کا سراپاان کی سادگی اوردرویشی پر گواہ ہو، یہ ادارے مستقل اورقابل بھروسہ مالی وسائل سے محروم عام مسلمانوں سے دودو چار چار پیسے کی مدد ہی ان کا توشۂ سفر، مدارس کی یہ سادگی ایسی تھی کہ لوگ اس کی طرف مڑکر دیکھتے بھی نہیں تھے اور سوچتے تھے کہ خس پوش جھونپڑیوں میں رہنے والے بوریہ نشیں اور دنیا کی لذتوں سے محروم اورنابلد لوگ کرہی کیا سکتے ہیں؟ شعراءاورنئی روشنی کے لوگ توان کی تحقیر سے بھی نہیں چوکتے تھے اوران کو''تنگ نظر ملا''اور''دورکعت کا امام''جیسے الفاظ سے یادکرتے تھے۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان ہی درویش مزاج ملاؤں نے اس ملک میں اسلام کے پودے کی حفاظت کی ہے،انھوں نے عہد بہار سے کوئی صلہ نہیں لیا؛لیکن عہدخزاں میں اپنے خونِ جگر سے سینچ کراسلام کے شجر طوبیٰ کو بچایا،اسلامی تہذیب وثقافت کا تحفظ کیااورمسلمانوں کا اپنے دین اور مذہب سے نہ صرف رشتہ باقی رکھا؛ بلکہ اس رشتہ کومضبوط سے مضبوط تر کرنے میں کامیاب ہوئے،یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان میں اسلام سے وابستگی کی جڑیں جتنی گہری ہیں اورلوگوں کے مزاج میں جتنی زیادہ مذہبیت ہے،عالم اسلام میں بھی کم ہی اس کی مثالیں مل سکیں گی،اس عجمی نژاد ملک میں علوم اسلامی کی جوخدمت ہوئی ہے،اس کی مثال بہت سے عرب اور مسلم ممالک میں بھی نہیں مل پائے گی،حکومت ختم ہونے کے باوجودلوگوں کے دینی رجحان میں جواضافہ ہواہے، اس میں بنیادی کردار مدارس ہی کا ہے،تقریباً گذشتہ ڈیڑھ صدی میں جوبھی تحریک یا جماعت اُٹھی ہے اور اسلام کی حفاظت یا اشاعت کا جو کچھ بھی کام ہواہے، اس میں ان مدارس اور مدارس سے پیدا ہونے والی شخصیتوں کا بڑا حصہ ہے، مدارس کی یہ اہمیت جواس کی ظاہری خستہ سامانی اورسادگی کی وجہ سے محسوس نہیں کی جاتی تھی،اب دوست اوردشمن سب اس کااحساس کرنے لگے ہیں۔

ہندوستان میں گذشتہ پچاس سال سے فرقہ پرستوں کی کوشش ہے کہ مسلمان فکری اورتہذیبی اعتبار سے اکثریت کے ساتھ ضم ہوجائیں،جس چیزکوآج''ہندوتوا''کہا جاتا ہے،اسی مقصد کے لئے ایک زمانہ میں ایسی سیاسی جماعتیں جواپنے آپ کوسیکولرکہاکرتی تھیں،بار بار مسلمانوں کوقومی دھارے میں شامل ہوجانے کی تلقین

کیا کرتی تھیں اور بھارتیہ کرن کا نعرہ لگاتی تھیں، اس دعوت کا مقصد بھی اصل میں یہی تھا کہ اب مسلمان اپنی مذہبی اور تہذیبی شناخت سے آزاد ہوجائیں اور دوسری قوموں کی طرح زیادہ سے زیادہ چند مذہبی رسوم کی ادائیگی پر اکتفاء کرلیں، ان نامسعود کوششوں کی ناکامی کا سہرا دینی مدارس کے سر جاتا ہے، اس حقیقت کو اربابِ اقتدار نے بھی محسوس کرلیا ہے، اس لئے دینی مدارس فرقہ پرست طاقتوں کا نشانہ ہیں، کبھی ان مدارس کو آئی ایس آئی کا مرکز قرار دیا جاتا ہے اور کبھی ان پر دہشت گردی کا الزام لگایا جاتا ہے، یہ محض اپنے اندرونی عناد کو چھپانے کے لئے ایک بہانہ ہے، حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

ہندوستان میں دہشت گردی کے ایک سے ایک واقعات پیش آچکے ہیں، گاندھی جی کا قتل ناحق ہو چکا ہے، پھر محترمہ اندرا گاندھی کا قتل ہوا، راجیو گاندھی قتل کئے گئے، بابری مسجد کی شہادت کا اندوہ ناک واقعہ پیش آیا جس کو موجودہ صدر آر کے نارائنن نے گاندھی جی کے قتل کے بعد سب سے تکلیف دہ واقعہ قرار دیا، میرٹھ، بھاگلپور اور مختلف علاقوں میں خود محافظ دستہ کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کے واقعات پیش آئے، ۱۹۸۴ء میں علانیہ سکھوں کا قتل عام ہوا اور سینکڑوں سکھ لڑکیاں غائب کر دی گئیں، سورت میں بے شرمی کا ایسا کھیل کھیلا گیا کہ جس کے تصور سے بھی جبین حیا عرق آلود ہوتی ہے، یہی تو دہشت گردی کے واقعات ہیں، یہ واقعات کن لوگوں کے ہاتھوں پیش آئے، دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کے ہاتھوں؟ یا مسلمانوں کے ہاتھوں؟؟ ---یہ محض مسلمانوں کو مرعوب کرنے، دینی مدارس کے تئیں غلط فہمیاں پھیلانے کا ایک حربہ اور بالواسطہ طریقہ پر مسلمانوں کو ان کی شناخت سے محروم کرنے کے طویل المدت پروگرام کا ایک حصہ ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان پورے شعور سے کام لیں، اس پروپیگنڈہ کا مقابلہ کریں اور اپنے ان دینی قلعوں کی حفاظت میں پہلے سے بڑھ کر فعال کردار ادا کریں۔

اس وقت پھر حکومت مدارس کے نظام کو متاثر کرنے کی سازش کررہی ہے، اور مختلف بہانوں سے مدارس کو بند کرنے کیلئے کوشاں ہے، اتر پردیش جو دینی مدارس کا سب سے بڑا مرکز ہے، وہاں باضابطہ بہت سے مدارس کو نوٹس جاری کردیا گیا ہے کہ وہ ان مدارس کے طلبہ کو سرکاری اسکولوں میں داخل کردیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ اور دوسری ملی تنظیمیں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کیلئے جدوجہد کررہی ہیں؛ مگر ضرورت ہے کہ

خود مدارس بھی اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور پوری جرأت ،حکمت اور مشترکہ وسائل کے ساتھ اس صورت حال کا مقابلہ کریں، اللہ کرے کہ مسلمان اپنی شہ رگ پر اس حملہ کو روکنے میں کامیاب ہوں ۔

اُردو زبان کی عمر دیگر زبانوں کے مقابل بہت کم ہے؛ لیکن اُردو میں اسلامیات کا ذخیرہ عربی زبان کے بعد سب سے زیادہ ہے؛ لہٰذا اُردو زبان کی بقا کی کوشش بھی ہمارا نہ صرف تہذیبی بلکہ مذہبی فریضہ بھی ہے، اور اس کے بقا کا طریقہ یہی ہے کہ جہاں ممکن ہو، وہاں اُردو میڈیم اسکول کے قیام کے لئے سرکار پر دباؤ ڈالا جائے ،خود بھی اُردو میڈیم اسکول قائم کئے جائیں اور اُردو اخبارات اور کتابیں پڑھنے کا مزاج بنایا جائے ، زندہ قوموں کے لئے زبان حیات وموت کا مسئلہ ہوتی ہے، ہم کو بھی اسی نظریہ اور جذبہ سے اُردو زبان کے مسئلہ کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

خالد سیف اللہ رحمانی
(بیت الحمد، شاہین نگر، حیدرآباد)

۲۷/محرم الحرام ۱۴۴۶ھ
۳/اگست ۲۰۲۴ء

• • •

کم عمری کی شادی اور شرعی نقطہ نظر

مولانا منور سلطان ندوی
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اسلامی شریعت میں شادی کے لئے کم سے کم عمر کیا طے کی گئی؟ اس موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ دیکھنا مناسب ہے کہ شریعت میں نکاح کی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟

نکاح کی تعریف

عام طور پر فقہاء نے نکاح کو زوجین کے درمیان ایک عقد قرار دیا ہے، علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں:

عقد بین الزوجین یحل به الوطء۔ (نیل الاوطار، ج۶، ص:۱۰۴)

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

هو عقد یفید ملك المتعة ای حل استمتاع الرجل من امراة لم یمنع من نکاحها مانع شرعی۔ (ردالمحتار ج۳، ص:۴)

چاروں ائمہ فقہ سے اسی طرح کی عبارتیں منقول ہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیۃ، ج۴۱، ص:۲۰۵)

دور حاضر میں مختلف مسلم ممالک کے علماء نے پرسنل لا کے موضوعات کو قانونی انداز میں پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں، ان مصنفین نے نکاح کی تعریف کو مزید واضح کیا ہے، شیخ عبدالوہاب خلاف مصری لکھتے ہیں:

هو عقد یفید حل استمتاع کل واحد من الزوجین بالآخر علی وجه المشروع ویجعل لکل منهما حقوقا قبل صاحبه وواجبات علیه۔ (احکام الاحوال الشخصیة فی الشریعة الاسلامیة، ص:۱۳)

امام ابوزہرہ مصریؒ نے نکاح کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

انه عقد يفيد حل العشرة بين الرجل والمراة وتعاونهما ويحدد مالكيهما من حقوق وما عليه من واجبات۔(الاحوال الشخصية،از امام ابوزهره مصری،ص:۱۷)

نکاح کے مقاصد

نکاح کو اللہ تعالی نے انسانی معاشرہ کی بھلائی کے لئے مشروع فرمایا ہے، یہ ایک ایسا نظام الہی ہے جس میں فرد اور معاشرہ دونوں سے متعلق بہت سے مصالح پوشیدہ ہیں، قرآن کریم کی متعدد آیات میں نکاح کے مقاصد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس سلسلہ کی چند آیات اس طرح ہیں:

۱۔ ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾ [الروم:21]

۲۔ ﴿وَاللهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ﴾ [النحل:72]

اس دونوں آیات میں میاں بیوی دونوں کو لفظ ''زوج'' سے تعبیر کیا گیا ہے، اس میں دونوں کی حیثیت اور دونوں کے حقوق وفرائض کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ ﴿وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ﴾ [النساء:24]

نکاح عفت وعصمت کا ذریعہ ہے، اور زنا سے بچنے کی بہترین تدبیر ہے۔ اسی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا:

فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ۔ (صحيح مسلم، كتاب النكاح)

ان آیات کی تفسیر میں مفسرین نے نکاح کے مقاصد بیان کیے ہیں، اسی طرح محدثین نے احادیث کی تشریح میں اور فقہاء نے فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے نکاح کے مصالح پر گفتگو کی ہے، یہاں بطور نمونہ فقہاء کی چند عبارتیں پیش کی جاتی ہیں:

امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

ثُمَّ يَتَعَلَّقُ بِهَذَا الْعَقْدِ أَنْوَاعٌ مِنَ الْمَصَالِحِ الدِّينِيَّةِ وَالدُّنْيَوِيَّةِ مِنْ ذَلِكَ حِفْظُ النِّسَاءِ وَالْقِيَامُ عَلَيْهِنَّ وَالْإِنْفَاقُ، وَمِنْ ذَلِكَ صِيَانَةُ النَّفْسِ عَنِ الزِّنَا، وَمِنْ ذَلِكَ

تَكْثِيرُ عِبَادِ اللَّهِ تَعَالَى وَأُمَّةِ الرَّسُولِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - وَتَحْقِيقُ مُبَاهَاةِ الرَّسُولِ۔ (المبسوط ج۴، ص:۱۹۲)

شافعی فقیہ زکریا بن محمد زکریا انصاریؒ لکھتے ہیں:

قال الاطباء:ومقاصد النكاح ثلاثة:حفظ النسل،واخراج الماء الذی یضر احتباسه بالبدن ونیل اللذة وهذه الثالثة هی التی فی الجنة اذ لا تناسل هناك ولا احتباس۔(اسنی المطالب، ج۳،ص:۹۸)

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کے شارح علامہ بابرتیؒ لکھتے ہیں:

وما اتفق من حكم من احكام الشرع مثل ما اتفق فی النكاح من اجتماع دواعی الشرع والعقل والطبع فأما دواعی الشرع من الكتاب والسنة والاجماع فظاهرة وأما دواعی العقل فان كل عاقل یحب ان یبقی اسمه ولا ینمحی رسمه، وما ذلك غالبا إلا ببقاء النسل وأما دواعی الطبع فان الطبع البهیمی من الذكر والانثی یدعوا إلی تحقیق ما اعد من المباضعات الشهوانیة والمضاجعات النفسانیة ولا مزجرة فیها اذا كانت بأمر الشرع وان كانت بدواعی الطبع بل یؤجر علیه۔(العنایة شرح الهدایة علی هوامش فتح القدیر، ج۳،ص:۱۸۵)

شیخ عبدالوہاب خلاف مصری نے نکاح کے مقاصد کو تفصیل سے بیان کیا ہے، ان کی تحریر کا خلاصہ اس طرح ہے:

ا۔نسل انسانی کی بقاء اس انداز میں جس انداز میں اللہ تعالی نے اس انسانی نسل کو باقی رکھنے کا فیصلہ فرمایا ہے۔کامل طریقہ سے نسل انسانی کی بقاء کی دو جہتیں ہیں:

اول: نکاح کا یہ نظام ایک سے زیادہ مرد کو ایک عورت سے رشتہ جوڑنے سے روکے گا، اس طرح باہم ظلم وزیادتی کا سلسلہ وجود میں نہیں آئے گا جو اس نظام کے نہ ہونے سے وجود میں آتا۔

دوم: نسب کی حفاظت ہوگی، اور ہر جوڑے کے بچوں کو باپ کی شکل میں ایسا گارجین ملے گا جو ان کی کفالت، پرورش کا ذمہ دار ہوگا، اور ان کو تحفظ فراہم کرے گا۔

۲۔زوجین کے درمیان رشتہ کی نوعیت کی تحدید اور دونوں میں سے ہر ایک کے حقوق اور ذمہ داریوں کی

تعیین۔

۳۔نفس کی پاکدامنی اورحلال طریقہ پر جنسی خواہش کی تکمیل،اورعصمت کو پامال کرنے پرروک ۔
(احکام الاحوال الشخصیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ،ص:۱۵)

امام ابوزہری مصری نے نکاح کے مقاصد میں مزید نفسیاتی،معاشرتی اوردینی پہلوؤں کا اضافہ کیا ہے،ان کی تحریر کا خلاصہ اس طرح ہے:

۱۔نکاح خاندان کی ایک مضبوط بنیاد واساس ہے،جہاں دینی تقدس کے ساتھ حقوق وواجبات متعین ہیں،جو یہ احساس دلاتا ہے کہ نکاح کے ذریعہ اس کی انسانیت بلند ہورہی ہے،یہ ایک ایسا روحانی رشتہ ہے جوانسان کوحیوانیت سے اٹھاتا ہے،یہ روحانی اورنفسیاتی رشتہ موت ورحمت کی شکل میں ہے جونکاح کا مقصود ہے۔

۲۔شادی خاندان کی بنیاد واساس ہے،اورخاندان سے ہی معاشرہ تشکیل پاتا ہے،انسان کوسماجی جانور کہاجاتا ہے،وہ سماج میں ہی رہ سکتا ہے،اوراس سماج کی پہلی اینٹ خاندان ہے،یہ ایسی اکائی ہے جہاں انسان حقوق وفرائض سے آشنا ہوتا ہے،اخوت وبھائی چارہ کے جذبات پروان چڑھتے ہیں،ایثاروہمدرری کے جڑیں گہری ہوتی ہیں،الغرض مضبوط معاشرہ کے لئے مضبوط خاندان ضروری ہے۔

۳۔نوع انسانی کی حفاظت مستقل ترقی پذیر ہے،اوریہ نکاح سے ہی ممکن ہے،محض تعلق واعتماد کی بنیاد پرنوع انسانی کوختم ہونے سے نہیں بچاسکتا،اس لئے جن قوموں میں شادی کا تناسب کم ہے وہاں بچوں کی شرح بھی کم ہوتی ہے،اورسال بہ سال ان کے افراد کی تعداد کم ہوتی رہتی ہے،اس کے مقابلہ میں جن قوموں میں شادی کا رجحان زیادہ ہوتا ہے ان کی تعداد مسلسل بڑھتی رہتی ہے،اورہمیں رسول اللہ ﷺ نے نسل میں اضافہ کے لئے شادی کی ترغیب دی ہے۔

۴۔شادی مردوعورت دونوں کے لئے حقیقی راحت کا ذریعہ ہے،عورت کوشادی کے نتیجہ میں شوہر ملتا ہے جوان کی ذمہ داری کو اٹھاتا ہے،اس طرح عورت کمانے سے بے فکر ہوکر گھراوربچوں کی پرورش کے لئے یکسو ہوجاتی ہے،یہی کام عورت کی طبیعت کے موافق ہے،اورجو چیز انسان کی طبیعت کے مطابق ہووہی حقیقی راحت ہے،گرچہ بظاہراس میں پریشانی ہے،اسی طرح مرد دن بھر کی محنت ومشقت کے بعد گھر پہونچ کرسکون پاتا ہے،اس تناظر میں اگرشادی کا نظام نہ ہوتا تو وہ ایسی دنیا میں ہوتا جہاں نہ ٹھکانہ ہوتا نہ سکون۔

(ملخص ازالاحوال الشخصیۃ،مصنف:امام ابوزہرہ مصری،ص:۲۰)

ان تفصیلات کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نکاح دوافراد کے درمیان عقد ضرور ہے، مگر یہ ایسا عمل ہے جس سے دوخاندان جڑتے ہیں، اورآئندہ ایک نیا خاندان وجود میں آتا ہے، اس تناظر میں نکاح جیسے عظیم عمل کا اختیار تنہا دوایسے بچوں کے حوالہ کردینا جنہوں نے ابھی ماہ وسال کے اعتبار سے بلوغ کی عمر کی ہے، کسی بھی طرح مناسب نہیں ہوگا۔

نکاح کی ذمہ داری کس پر؟

بالغ بچے اپنا نکاح خود کرسکتے ہیں، البتہ نکاح کرانے کی ذمہ داری والدین یا گارجین کے سپرد کی گئی ہے، شریعت نے اولیاء یعنی بچوں کے گارجین کو یہ ذمہ داری دی ہے کہ وہ بچوں کی پرورش اور تربیت کے ساتھ ان کا نکاح بھی کرائیں، قرآن کریم اوراحادیث میں اس کے واضح اشارے موجود ہیں، سورہ نور میں ہے:

﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَى مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ [النور: 32]

﴿فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ﴾ [النساء: 25]

والدین پر اولاد کے حقوق میں سے ایک سن بلوغ کو پہونچنے کے بعد ان کا نکاح کرانا ہے:

عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ من ولد له ولد فیلحسن اسمه وادبه فاذا بلغ فلیزوجه فان بلغ ولم یزوجه فما اصاب اثما فانما اثمه علی ابیه۔(شعب الایمان للبیهقی، باب حقوق الاولاد، حدیث نمبر: 8299)

ائمہ فقہ میں امام احمد بن حنبل اس بات کے قائل ہیں کہ والد پر نکاح کرانا واجب ہے، جس طرح ان پر نفقہ واجب ہے، فقہ حنبلی کی کتاب الانصاف میں ہے:

یجب علی الرجل اعفاف من وجبت نفقته علیه من الآباء والاجداد والابناء وابنائهم وغیرهم ممن تجب علیه نفقتهم وهذا الصحیح من المذهب۔ (الانصاف، ج۲۴، ص:۴۲۰)

شادی کی کم سے کم عمر۔ اسلامی نقطہ نظر

شریعت میں نکاح کی عمر متعین نہیں ہے، قرآن اوراحادیث میں نکاح کے لئے مطلوبہ عمر کے بارے میں صراحتاً کوئی حتمی رائے مذکور نہیں ہے، کتاب وسنت میں متعدد ایسے اشارے موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ سن بلوغ کی عمر سے پہلے نکاح ہوسکتا ہے، وہیں اس بات کے بھی اشارے موجود ہیں کہ سن بلوغ کے بعد

نکاح ہونا چاہئے۔

سن بلوغ کے بعد نکاح کرنے سے متعلق نصوص

شریعت میں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ جب بچے سن بلوغ کو پہونچ جائیں تو ان کا نکاح جلد از جلد کرادینا چاہیے، تاکہ وہ گناہ میں مبتلا نہ ہو،قرآن کریم میں غیر شادی شدہ بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کا حکم دیا گیا ہے،سورہ نساء میں ہے کہ یتیموں کو آزماؤ، جب وہ نکاح کو پہونچ جائیں اور تم ان میں ہوش مندی محسوس کرو تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو:

۱۔﴿وَ ابۡتَلُوا الۡیَتَامٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ﴾ [النساء:6]

۲۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے نکاح سے متعلق یہ بات ارشاد فرمائی:

يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ. فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ (صحيح مسلم، كتاب النكاح)

۳۔اسی طرح والدین پر اولاد کے جو حقوق واجب ہیں، ان میں ایک سن بلوغ کو پہونچنے کے بعد ان کا نکاح کرانا بھی ہے:

۱:عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم من ولد له ولد فليحسن اسمه وادبه، فاذا بلغ فيلزوجه، فان بلغ ولم يزوجه فما أصاب اثما فانما اثمه على ابيه۔(شعب الايمان للبيهقي، باب في حقوق الاولاد، حديث نمبر: 8299)

۲:عن عمر بن الخطاب وانس بن مالك عن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم قال :في التوراة مكتوب من بلغت ابنته اثنتى عشرة سنة ولم يزوجها فاصابت اثما فثم ذلك عليه۔(شعب الايمان باب في حقوق الاولاد، حديث نمبر: ٨٦٦٩)

۴۔اسلام میں لڑکے اور لڑکیوں کو رشتہ کے انتخاب کی آزادی دی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، اس اختیار کا تقاضہ یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد نکاح کا عمل ہو، کیونکہ سن بلوغ کو پہونچنے کے بعد ہی وہ اس اختیار کو استعمال کرنے کے اہل ہوں گے۔

۵۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادیوں کا نکاح عمر بلوغ کے بعد ہی فرمایا ہے، اس سے بھی معلوم

ہوتا ہے کہ نکاح بالغ ہونے کے بعد ہونا چاہیے۔

۶۔فقہاء میں ابن شبرمہ، ابوبکراصم اور عثمان البتی کی رائے یہی ہے کہ صغیر اور صغیرہ کا نکاح کروانا جائز نہیں ہے، یہ حضرات سورہ نساء کی مذکورہ آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

ب۔ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ باپ اور دادا کو ولایت کا جو حق دیا گیا ہے وہ حاجت کی بنیاد پر ہے، اور کم سن بچوں کو شادی کی ضرورت نہیں ہے۔

ج۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کا نکاح چھ سال میں ہوا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔

د۔صغیر پر نکاح کی ولایت نہیں ہوتی ہے، کیونکہ عقد نکاح صغر کے متنافی ہے۔

۷۔مصر کے عائلی قوانین میں کم سنی کی شادی کے تعلق سے قانون سازی کرنے میں ان فقہاء کی رائے سے استدلال کرتے ہوئے نکاح کی عمر سن بلوغ طے کیا گیا ہے۔(تفصیل کے لئے دیکھئے: الاحوال الشخصیۃ، از امام ابوزہرہ مصری، ص:۱۰۹)

۷۔ابن حزم کی رائے یہ ہے کہ لڑکے کا نکاح بلوغ سے قبل جائز نہیں ہے، البتہ لڑکی کا نکاح بلوغ سے قبل جائز ہے۔

ابن حزم کی دلیل یہ ہے کہ احادیث اور آثار جو کم سن کے نکاح کی اجازت کے سلسلہ میں وارد ہیں وہ صغیرہ یعنی لڑکی سے متعلق ہیں، لڑکوں سے متعلق نہیں ہے۔(محلی ابن حزم، ج۹،ص:۴۶۰، تفصیل کے لئے دیکھئے: احکام الزواج فی الفقہ الاسلامی وما علیہ العمل فی دولۃ الامارات العربیۃ المتحدۃ، از عبدالرحمن الصابونی، ص:۲۱۵، الموسوعۃ الفقہیۃ، ج۹،ص:۶۶۸۲)

سن بلوغ سے قبل نکاح کی اجازت سے متعلق نصوص

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ بلوغت کی عمر سے قبل نکاح کرنا جائز ہے، ائمہ اربعہ سے یہی منقول ہے، (المبسوط، ج۴،ص:۱۹۰، المغنی، ج۹،ص:۴۰۲، مغنی المحتاج، ج۳،ص:۱۶۸) اکثر علماء نے اس رائے پر اجماع بھی نقل کیا ہے، جمہور علماء کے دلائل اس طرح ہیں:

﴿وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ﴾ [الطلاق:4]

اس آیت میں مطلقہ صغیرہ کی عدت کا ذکر ہے جن کو ابھی ناپاکی کا سلسلہ شروع نہیں ہوا ہے۔اس آیت

کے شان نزول کے بارے میں روح المعانی کا مطالعہ مفید ہوگا۔

۲۔عن عائشۃ رضی اللہ عنھا ان رسول اللہ ﷺ تزوجھا وھی بنت ست وبنی بھا وھی بنت تسع۔(صحیح مسلم،باب تزویج الاب البکر الصغیرۃ،حدیث نمبر:۱۴۲۲)

۳۔عن الحسن قال:قال رسول اللہ ﷺ اذا انکح الرجل ابنہ وھو کارہ فلیس بنکاح واذا زوجہ وھو صغیر جاز نکاحہ۔(مصنف ابن ابی شیبہ،باب فی رجل یزوج ابنہ وھو صغیر، حدیث نمبر:16010)

۴۔مشہور محدث ابن ابی شیبہ نے اپنے مجموعہ المصنف میں اور محدث عبدالرزاق نے اپنی المصنف میں متعدد صحابہ کا عمل نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کی شادی سن بلوغ سے پہلے کی تھی۔(حوالہ سابق)

۵۔علامہ ابن منذر نے اس مسئلہ میں تمام مسلمانوں کا اتفاق نقل کیا ہے،علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

فاما الاناث فللاب تزویج ابنتہ البکر الصغیرۃ التی لم تبلغ تسع سنین بغیر خلاف اذا وضعھا فی کفائۃ،قال ابن منذر:اجمع کل من تحفظ عنہ من اھل العلم ان نکاح الاب ابنتہ البکر الصغیرۃ جائز اذا زوجھا من کفء یجوز لہ ذلک مع کراھتھا وامتناعھا۔ (المغنی، ج۹، ص:۲۹۸)

اسی طرح سعدی ابوجیب لکھتے ہیں:

اجمعوا علی ان انکاح الاب ابنہ الصغیر جائز ...وان اجماع المسلمین علی ان للاب ان یزوج ابنتہ الصغیرۃ۔(موسوعۃ الاجماع فی الفقہ الاسلامی، ج۳،ص:۱۱۸۵)

مذکورہ بالا تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں نکاح کے باب میں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد نکاح کیا جائے،البتہ اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ سن بلوغ سے قبل بھی نکاح ہوسکتا ہے،مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

اسلام میں کم سنی میں لڑکے یا لڑکی کے نکاح کی ترغیب نہیں دی ہے،البتہ اس سے منع بھی نہیں کیا ہے،اور اس کی گنجائش رکھی ہے،جس کا ثبوت قرآن مجید سے بھی ہے،حدیث

سے بھی ہے، آثار صحابہ سے بھی ہے، اور اس امت کا اجماع واتفاق بھی ہے، نیز یہ حکم بعض مصالح پر مبنی ہے۔ (مسلم پرسنل لا اور بعض غلط فہمیاں، ص: ۲۲)

مذکورہ رائے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بلوغت کے آثار ظاہر ہونے میں علاقہ، صحت اور آب وہوا کا خاص اثر ہوتا ہے، ملک کے مختلف حصوں میں بلوغت کی عمر الگ الگ ہوسکتی ہے، اسی طرح جسمانی صحت کے لحاظ سے بھی اس میں فرق ہوسکتا ہے، اس تناظر میں اس بات کا امکان موجود رہے گا کہ بلوغ کی جو بھی عمر متعین کی جائے، اس عمر سے قبل ہی کچھ بچے بالغ ہوجائیں گے، اوران میں جنسی ضرورت کا احساس پیدا ہوجائے گا۔

کم سنی کے نکاح میں مصالح کی رعایت

بسا اوقات مصلحت اسی میں ہوتی ہے کہ بچوں کے شادی سن بلوغ سے قبل کردیا جائے، لہذا اس کی گنجائش ہونی چاہیے، اگر ایک متعین عمر طے کردی جائے تو اس طرح کے بہت سے مصالح فوت ہوجائیں گے، اگر باپ یا دادا کو نظر آئے کہ بچہ کا مفاد اس میں ہے کہ اس کی شادی کم عمری میں ہی کردی جائے تو ایسا کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اگر بچوں میں اخلاقی بگاڑ کا اندیشہ ہے، اگر انہیں ۱۸ یا ۲۱ سال تک روکا گیا تو اس سے مزید اخلاقی مفاسد پیدا ہوں گے، ایسی صورت میں بہتر یہی ہوگا کہ اس کے لئے نکاح کا جائز راستہ کھول دیا جائے، استاذ گرامی مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب ایک اور مصلحت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اسی طرح بسا اوقات یہ مصلحت بھی ہوتی ہے کہ بعض دفعہ باپ لب گور ہوتا ہے، ظاہری حالت کے تحت اندیشہ ہے کہ اس کے بچوں کو یتیمی کا داغ لگنے والا ہے، اور اس کی موت کے بعد خاندان میں ایسے ذمہ دار اور دیانت دار لوگ نہیں ہیں جن سے امید رکھی جاسکے کہ وہ اس کی موت کے بعد وہ صحیح طور پر بچوں کی تربیت کرسکیں گے، اور مناسب رشتہ تلاش کرکے اس کے بے سہارا بچوں کی شادی کریں گے، ابھی بچے نابالغ ہیں، لیکن ایک موزوں رشتہ ہاتھ آرہا ہے، تو ایسی صورت میں یقینا مصلحت یہی ہے کہ اس وقت اس کا نکاح کردیا جائے، کہ اس میں اس کے لب گور سرپرست کے لئے سکون قلب بھی ہے اور اس کے بچوں کے مستقبل کے محفوظ ہونے کی امید بھی۔ (مسلم پرسنل لا اور بعض غلط فہمیاں، ص: ۲۲)

سن بلوغ سے قبل کئے گئے نکاح میں خطرات کا سد باب

سن بلوغ سے قبل نکاح کرنے کی صورت میں بعض خطرات بھی ہیں، مثلا ایک خطرہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ جب یہ بچے بالغ ہوں تب وہ ایک دوسرے کو پسند نہ کریں، اس خطرہ کا ازالہ خیار بلوغ کی صورت میں شریعت میں موجود ہے۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ بچوں کے ساتھ زیادتی ہوجائے، اولیاء کسی دباؤ یا لالچ میں آ کر صحیح فیصلہ نہ کریں، اس ضرر کا ازالہ بھی شریعت میں موجود ہے، شریعت میں انہی اولیاء کو کم سن بچوں کے نکاح کا حق دیا گیا ہے جو اپنے غلط انتخاب سے معروف نہ ہوں، فقہ کی تعبیر میں معروف بسوء الاختیار نہ ہوں، اس کے علاوہ بعض فقہاء نے ایسے نکاح کے لئے کفو کو بھی شرط قرار دیا ہے، غالبا اسی بناء پر علامہ ابن قدامہ نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر نابالغ بچوں کا نکاح ان کے باپ یا دادا کر رہے ہوں اور بچہ نکاح سے انکار کرے؛ بلکہ منع کرے تب بھی اولیاء کو اس کے نکاح کی اجازت ہوگی بشرطیکہ وہ کفو میں ہو:

قال ابن منذر: اجمع کل من تحفظ عنه من اهل العلم ان نکاح الاب ابنته البکر الصغیرة جائز اذا زوجها من کف ء یجوز له ذلک مع کراهتها وامتناعها۔ (المغنی، ج ۹، ص: ۲۹۸)

امام نووی نے صحیح مسلم کی شرح میں یہی بات لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

واعلم ان الشافعی واصحابه قالوا: یستحب ان لا یزوج الاب والجد البکر حتی تبلغ ویستاذنها لئلا یوقعها فی اسر الزوج وهی کارهة وهذا الذی قالوا لا یخالف حدیث عائشة لان مرادهم انه لا یزوجها اذا لم تکن مصلحة ظاهرة یخاف فوتها بالتاخیر کحدیث عائشة فیستحب تحصیل ذلک الزوج لان الاب مامور بمصلحة ولده فلا یفوتها۔ (صحیح مسلم، ج ۹، ص: ۲۰۶)

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے بھی اپنی مشہور کتاب المفصل فی احکام المراة والبیت المسلم میں یہی رجحان ظاہر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

نرجح علی وجه الاستحباب ان لا یزوج الاب ابنته حتی تبلغ الا اذا وجد المبرر المقبول لتزویجها وهی صغیرة۔ (المفصل فی احکام المراءة والبیت المسلم، ص: 402)

کم سنی کی شادی۔صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کم سنی کی شادی صرف مسلمانوں میں ہوتی ہے، حالانکہ حقیقت بالکل برعکس ہے، ہندوؤں کے یہاں کم سنی کی شادی بہت زیادہ ہوتی ہے، راجستھان میں ''اکھا تیج'' کے موقع پر ہزاروں شیرخوار لڑکیوں کی شادی کی جاتی ہے، راجستھان، مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور ہریانہ کے بعض علاقوں میں ہندوسماج میں بہت ہی کم سنی میں نکاح کا رواج ہے، ۲۰۱۱ء کے ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق بارہ ملین بچوں کی شادی ۱۰ سال سے پہلے ہوئی، ان میں 84% ہندو بچے ہیں، اور 11% مسلم بچے، india Spend کے تجزیہ کے مطابق کم عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کا تناسب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس طرح ہے:

ہندو لڑکے 3.56
مسلم لڑکے 0.49
ہندو لڑکیاں 6.65
مسلم لڑکیاں 0.88

(Census of india/india Spend)www.indiaspend.com)

کم سنی کی شادی دیہاتوں میں زیادہ ہوتی ہے، اس لئے دیہات اور شہر دونوں کے تناسب میں خاصہ فرق پایا جاتا ہے۔

متمدن دنیا میں نکاح کی کم سے سے عمر

ہمارے یہاں جو قوانین بنائے جاتے ہیں وہ عموماً متمدن دنیا سے درآمد کئے جاتے ہیں، اس لحاظ سے اس مسئلہ میں یہ دیکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ متمدن دنیا نے اپنے ملکوں میں نکاح کے لئے کم سے کم کیا عمر متعین کی ہے؟

امریکہ پچاس ریاستوں کی یونین ہے، جس کی ہر ریاست کو اپنا عائلی قانون بنانے کا اختیار ہے، ان ریاستوں میں سے دو ریاست الاسکا اور نارتھ کیرولینا میں شادی کی کم سے کم عمر ۱۴ سال ہے، چار ریاستوں میں پندرہ سال، انیس ریاستوں میں شادی کی کم سے کم عمر سولہ سال ہے، سات ریاستوں میں سترہ سال، اور سترہ ریاستیں ایسی ہیں جہاں شادی کی کم سے کم کوئی عمر متعین نہیں ہے۔

امریکہ میں کم سنی کی شادی چند شرائط کے ساتھ مشروط ہیں، مثلاً کم سن لڑکی نے بچہ کو جنم دیا ہو، کم سن کے ماں باپ مر گئے ہوں یا معلوم نہ ہوں، لڑکی حاملہ ہوگئی ہو، والدین یا قانونی سرپرست نے اس کی اجازت دی ہو، اور یہ عدالتی اطمینان ہو کہ اس کم سن کی شادی ممکن ہے، بعض ریاستوں میں ایک دوشرط اور بعض میں اس سے زیادہ شرائط پائے جاتے ہیں۔(یہ معلومات ڈاکٹر شہزادانجم اقبال شام، کے صغرسنی کی شادی پر عدالتی فیصلے کا جائزہ سے ماخوذ ہے، یہ مضمون الشریعہ اکادمی میں شائع ہوا ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے:

(https://alsharia.org/2022/apr/sighar-sani-shadi-dr-shehzad-iqbal

امریکہ کی جن ریاستوں میں شادی کی کم از کم عمر متعین نہیں ہے، وہاں بچہ کی پیدائش کے بعد کبھی بھی اس کی شادی ممکن ہے، بس اس کے لئے عدالتی اطمینان ضروری ہے۔

مشہور امریکہ تھنک ٹینک پیو (pew) کی تحقیق کے مطابق صرف ۲۰۱۴ء میں 57800 ایسے بچوں کی شادیاں ہوئیں جن کی عمر ۱۵ تا ۱۷ سال تھیں، ان میں سے 31644 کم سن بچیاں تھیں، ایک اور ادارہ ان چینڈ ایٹ لاسٹ (Unchained at last) جس کا مقصد جبری اور کم سنی کی شادیوں کو روکنا ہے، اس کی تحقیق کے مطابق اکیسویں صدی کی ابتدائی پندرہ سالوں میں دولاکھ بچوں کی شادی انہی قوانین کے مطابق ہوئیں، اس دولاکھ میں ۱۴ سال سے کم عمری کی شادیوں کی تعداد دوہزار ہے، ۱۳ سالہ بچوں کی تعداد ۵۱ / ہے، ۶ بچوں کی شادیاں ۱۲ سال میں ہوئی، ایک اور یاست میں ۱۰ سالہ بچیوں کی شادیاں ۲۴ تا ۳۱ سالہ مردوں سے ہوئیں۔

اس مسئلہ کو اگر انسانی حقوق کے تناظر میں دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ جس طرح کسی شخص کا جسمانی نظام بھوک اور پیاس کا تقاضا کرتا ہے، اور اسے غذا کی ضرورت ہوتی ہے، لہذا کس تمدن میں اسے کھانا دینے سے روکا جاسکتا ہے، اسی طرح کسی شخص کا جسمانی نظام نو دس سال کی عمر میں ہی صنف مخالف کا تقاضہ کرے تو اسے اپنی ضرورت پوری کرنے سے روکنا یا اسے ایک متعین عمر کا پابند بنانا کیسے روا ہوسکتا ہے۔

کم سنی کی شادی کی تعداد میں کمی

مختلف رپورٹوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ملک میں مجموعی طور پر جس طرح تعلیم کا گراف بڑھ رہا ہے، عام لوگوں میں صحت اور تعلیم کے حوالہ سے بیداری آرہی ہے، اسی طرح رفتار سے کم سنی کی شادی میں کمی واقع ہورہی ہے، مسلمانوں میں بھی کمسنی کی شادی کا رجحان بہت کم ہوا ہے۔

شادی اور طبی نقطہ نظر

کم عمری کی شادی پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ کم عمری کی شادی کی صورت میں طبی لحاظ سے زیادہ مسائل پیش آتے ہیں، اور اکثر اوقات تولید میں پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں، اس اعتراض کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا خالدسیف اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> اول یہ کہ جسمانی نشوونما تمام لڑکوں اورلڑکیوں میں یکساں نہیں ہوتی، موسمی حالات، غذا، ماحول اور موروثی اثرات کے تحت بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے، اور جسمانی قویٰ اور تولید کی صلاحیت میں بھی فرق ہوتا ہے، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸ سال کی کم عمری ہرلڑکی کے لئے ماں بننا نقصاندہ ہے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸ سال کے بعد لامحالہ ایسی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے کہ ماں بننا اس کی صحت کے لئے مضرت رساں نہ ہو، اس لئے ۱۸ سال ہی کی تعیین قابل فہم نہیں۔(مسلم پرسنل لا اور بعض غلط فہمیاں، ص:۱۶)

ایک رپورٹ کے مطابق جلد شادی کرنے سے ۳۷ سال کی عمر میں نیند کا معیار بہتر ہوتا ہے، لیکن اگر تاخیر سے شادی ہوتی ہے تو اس عمر میں نیند کا معیار خراب ہونا شروع ہوجاتا ہے جس سے بلڈ پریشر اور ہارڈ اٹیک کا خطرہ بڑھ جاتا ہے، یہ بات سبھوں کے مشاہدہ میں ہے کہ جس طرح بہت جلد شادی کرنے سے رشتہ کے ٹوٹنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے اسی طرح بہت دیر سے شادی کرنے سے بھی یہ خطرہ بڑھ جاتا ہے، اس لئے یہ کہنا کہ سن بلوغ سے پہلے نکاح کرنا ہر حال میں لڑکی کی صحت کے لئے نقصاندہ ہے، صحیح نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ اسلام میں بلوغ سے قبل نکاح کی اجازت ہے، جنسی تعلق قائم کرنے کے لئے لڑکی کا جسمانی لحاظ سے اس قابل ہونا ضروری ہے، اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو طب کے حوالہ سے جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ بڑی حد تک بے وزن ہوجاتی ہیں۔

نکاح کی عمر اور جنسی تعلق کی عمر میں فرق

اس مسئلہ میں یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ سن بلوغ سے قبل نکاح کی اجازت ہے، لیکن جنسی تعلق کو اس وقت تک کے لئے ٹالا گیا ہے جب تک لڑکی کی عمر اس قابل نہ ہوجائے، یعنی کم سنی میں نکاح تو درست ہے، مگر جنسی تعلق کی اجازت نہیں ہے، اکثر فقہاء نے جہاں تعلق قائم کرنے کی عمر نو سال بیان کی ہے، وہیں یہ بات لکھی ہے

کہ جنسی تعلق کے لئے صرف بلوغ کافی نہیں ہے؛ بلکہ لڑکی جسمانی لحاظ سے اس قابل ہونا بھی ضروری ہے، الفتاوی الہندیۃ میں ہے:

اکثر المشائخ علی انہ لا عبرۃ للسن فی ھذا الباب وانما العبرۃ للطاقۃ ان کانت ضخمۃ سمینۃ تطیق الرجال ولا یخاف علیھا المرض من ذلك کان للزوج ان یدخل بھا، وان لم تبلغ تسع سنین وان کانت نحیفۃ مھزولۃ لا تطیق الجماع ویخاف علیھا المرض لا یحل للزوج ان یدخل بھا ان کبر سنھا وھو الصحیح۔ (الفتاوی الھندیۃ: 287/1)

کم سنی کی شادی کا اختیار کس کو؟

کم سنی میں شادی کرنا جائز ہے، جمہور علماء کی یہی رائے ہے، البتہ نکاح کرانے کا اختیار کس کو حاصل ہوگا، اس بارے میں فقہاء کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے، احناف کے نزدیک باپ داد کے علاوہ عصبات کو بھی کم سن بچوں کے نکاح کا حق حاصل ہوگا، جبکہ امام شافعی کے نزدیک صرف باپ اور دادا کو یہ حق حاصل ہوگا۔ امام مالک کے نزدیک صرف باپ کو یہ حق حاصل ہوگا، ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج۹، ص: ٦٦٨٥)

سن بلوغ سے قبل کئے گئے نکاح میں خیار بلوغ کا حق

یہاں دوسری بحث یہ بھی ہے کہ کم سنی میں نکاح ہونے کی صورت میں بالغ ہونے کے بعد انہیں خیار بلوغ کا حق حاصل ہوگا، خیار بلوغ کا حق اس لئے ہے کہ اگر وہ اپنے اولیاء کے فیصلہ سے متفق نہ ہوں تو وہ اس رشتہ کو ختم کردیں، خیار بلوغ کے بارے میں فقہاء کی آراء میں بھی قدرے اختلاف ہے، فقہائے احناف کے نزدیک باپ اور دادا کا کیا ہوا نکاح لازم ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ سوء الاختیار سے معروف نہ ہوں، البتہ باپ اور دادا کے علاوہ دیگر عصبات کے ذریعہ نکاح ہوا ہے تو ایسی صورت میں بالغ ہونے کے بعد خیار کا حق حاصل ہوگا۔

باپ داد کو ولایت کا حق کب ملتا ہے؟

فقہاء نے یہ تفصیلات بھی بیان کی ہیں کہ باپ اور دادا کو کم سن کی شادی کے حوالے سے جو ولایت حاصل ہوتی ہے اس کی شرطیں کیا کیا ہیں، شیخ ابوزہرہ مصری نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے کہ ولایت اجبار کے ثبوت کی بنیادیں کیا ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ ولایت اجبار کی دو بنیادیں ہیں، اول شفقت جو مولی علیہ یعنی

بچہ کی مصلحت کا خیال رکھنے پر مجبور کرے، اور دوسری بنیاد حسن راء یعنی زیادہ بہتر کا انتخاب کرنا ہے (الاحوال الشخصیۃ، ص:۱۱۸)

فقہائے احناف کے نزدیک ولایت اجبار کے تین مراتب ہیں:

۱۔اول باپ اور دادا، باپ اور دادا میں شفقت سب سے زیادہ پائی جاتی ہے، لہذا اگر یہ دونوں معروف بسوءالاختیار نہ ہوں، پاگل اور فاسق نہ ہوں، تو ان کا کیا ہوا نکاح لازم ہوگا۔

۲۔باپ اور داد معروف بسوء الاختیار ہوں، یا فاسق ہوں، ایسی صورت میں ان کا کیا ہوا نکاح اسی وقت لازم ہوگا جب کہ انہوں نے کفو میں نکاح کیا ہو، اور مہر مثل کی صورت میں مہر طے کیا ہو۔

۳۔باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے عصبات نے نکاح کیا ہے، تو چونکہ ان میں شفقت پوری نہیں پائی جاتی ہے، لہذا اگر کفو ہے اور مہر مثل طے پایا ہے تبھی ان کا کیا ہوا نکاح صحیح ہوگا۔

امام ابو یوسف اور امام محمدؒ نے نابالغ بچوں کی شادی میں کفو اور مہر مثل کو شرط قرار دیا ہے، یعنی اگر باپ اور دادا بھی ان دونوں باتوں کی رعایت نہیں کریں گے تو ان کا کیا ہوا نکاح درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ ولایت مصلحت کی بنیاد ہے، اور غیر کفو میں کرنا بچہ کے مفاد کے خلاف ہے۔

امام شافعی نے بھی بچوں کی شادی میں مصلحت کو ضروری قرار دیا ہے، ان کے نزدیک بچوں کی اجازت کے بغیر ان کا نکاح کرانے کی سات شرطیں ہیں خواہ بچہ نابالغ ہو یا بالغ، ان میں سے چند شرائط اس طرح ہیں:

۱۔والدین اور بچہ کے درمیان کوئی ظاہری عداوت نہ ہو۔

۲۔بچہ کی شادی کفو میں کرائی جا رہی ہو۔

۳۔نکاح مہر مثل کے ساتھ ہو رہا ہو۔

۴۔ایسے آدمی سے نکاح نہ کرائے جو مہر ادا کرنے سے قاصر ہو۔

۵۔ایسے آدمی سے نکاح نہ کرائے جس کے ساتھ رہنا اس کے لئے پریشانی کا سبب ہو، مثلا اندھا یا بوڑھا آدمی۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج۹، ص:۶۶۸۵)

ان تفصیلات سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔اسلام میں کم سنی میں نکاح کی اجازت ہے، یعنی گنجائش ہے، اس کی ترغیب نہیں دی گئی ہے؛ بلکہ سن بلوغ کی عمر کو پہونچنے کے بعد نکاح کا حکم دیا گیا ہے۔

۲۔ بسااوقات مصالح اس کے متقاضی ہوتے ہیں کہ کم سنی میں نکاح کیا جائے ،شریعت میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

۳۔ بہتر ہے کہ نکاح بالغ ہونے کے بعد ہی کیا جائے۔

۴۔ کم سنی کے نکاح میں جو خطرات اور اندیشے پائے جاتے ہیں ،شریعت میں ان دور کرنے کا مکمل نظام موجود ہے، الغرض کم سنی میں نکاح کی اجازت عین فطرت کے مطابق ہے۔

● ● ●

فقہ مقارن اور علم الخلاف — ایک تعارف

محمد جمیل اختر جلیلی ندوی ◆
ہدی چلڈرنس اکیڈمی، دھنباد (جھارکھنڈ)

موجودہ زمانہ صرف ٹیکنالوجی کے اعتبار سے ہی ترقیات کا زمانہ نہیں ہے؛ بل کہ تعلیمی اعتبار سے بھی ترقیات کا زمانہ ہے، اس زمانہ میں ایسی ایسی تعلیمی ترقیاں ہوئی ہیں، جو گزشتہ ادوار میں نہیں ہوئی تھیں، اس دوڑ میں اسلامی علوم بھی شامل ہیں، ''علم الخلاف'' کا فن اگرچہ علوم اسلامی کے سرمایہ میں موجود تھا؛ لیکن اپنے قدیم طرز پر، اب اسے جدید طرز پر مرتب کرنے کی ضرورت تھی، 'فقہ مقارن' اسی کی جدید شکل ہے، ذیل میں دونوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

فقہ مقارن کی تعریف

''فقہ مقارن'' دولفظوں سے مرکب ہے، ایک لفظ ''فقہ'' ہے اور دوسرا ''مقارن''، دونوں کو جوڑنے سے ''فقہ مقارن'' وجود میں آتا ہے، پہلے ہر ایک کی علاحدہ علاحدہ تعریف ذکر کی جارہی ہے۔

فقہ کی تعریف

فقہ کے اصل معنی ''کسی چیز کے جاننے اور سمجھنے'' کے آتے ہیں، قرآن مجید میں ہے:

﴿قَالُوا يَاشُعَيبِ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا وَلَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ﴾ [هود: 91]

انھوں نے کہا کہ شعیب تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہم میں کمزور بھی ہو اور اگر تمہارے بھائی بند نہ ہوتے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے اور تم ہم پر (کسی طرح بھی) غالب نہیں ہو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾
[التوبة: 122]

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے؛ تا کہ دین (کا علم سیکھتے اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے؛ کہ وہ بچیں۔

اور حدیث میں ہے:

من یرداللہ بہ خیراً یفقہ فی الدین۔(صحیح البخاری، باب من یرداللہ بہ خیراً یفقہ فی الدین، حدیث نمبر:۷۱)

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے، اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔

پھر تمام علوم پر علم دین کی فضیلت، شرافت اور سیادت کی وجہ سے خاص ''علم دین کی سمجھ'' کو فقہ کہا جانے لگا، ابن منظور کہتے ہیں:

وغلب على علم الدين لسيادته وشرفه وفضله على سائر أنواع العلم، كماغلب النجم على الثريا، والعُود على المَنْدَل۔(لسان العرب، مادة: فقه: ۵۲۲/۱۳، نیز دیکھئے: المعجم الوسيط، ص: ۶۹۸، مادة: فقه)

اور تمام علوم پر علم دین کی فضیلت، شرافت اور سیادت کی وجہ سے علم دین پر غالب آ گیا، جیسا کہ (لفظ) 'نجم' (لفظ) 'ثریا' پر اور (لفظ) 'عود' (لفظ) 'مندل' پر غالب آ گیا۔

موجودہ زمانہ میں اس علم کو ''قانون اسلامی کا علم'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

فقہ کی اصطلاحی تعریف

اصطلاح میں 'فقہ' ''احکام شرعیہ فرعیہ کو اس کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جاننے'' کا نام ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

العلم بالأحكام الشرعية الفرعية المكتسب من أدلتها التفصيلية (ردالمحتار، مقدمة الكتاب: ۱/۱۱۹-۱۱۸)

تفصیلی دلائل سے حاصل ہونے والے فرعی احکام کو جاننا۔

فقہ کی اصطلاحی تعریف میں کئی الفاظ قابل توضیح ہیں:

۱- **الأحكام**: احکام کہہ کر ذوات (جیسے: متعین شخص زید، بکر اور عمرو وغیرہ) اور صفات حقیقیہ (یعنی ذات سے متعلق لازم علامت، جیسے: اللہ تعالیٰ کے لئے علم، قدرت اور حیات ازلی وغیرہ) کے علم سے بچنا مقصود ہے۔ (**المحصول فی أصول الفقه، الفصل الأول فی تفسیر أصول الفقه: ۱/ ۷۹**)

۲- **الشرعية**: شرعیہ کہہ کر احکام حسیہ (جیسے: آگ جلانے والا چیز ہے)، احکام عقلیہ (جیسے: ظلم بری شئ ہے یا ایک دو کا آدھا ہے) اور احکام وضعیہ (جیسے: فاعل مرفوع ہوتا ہے، اَنَّ کا اسم منصوب ہوتا ہے) جیسے علوم سے بچنا مقصود ہے۔ (**أصول الفقه لمحمد زكريا البرديسی، ص: ۲٦**)

۳- **الفرعية**: فرعیہ کہہ کر یہ بتایا گیا کہ ان کا تعلق فروع سے ہو؛ چنانچہ اصولی احکام اس سے خارج ہوگئے، جیسے: اجماع اور قیاس حجت ہے۔

۴- **من أدلته التفصيلة**: تفصیلی دلائل سے مراد وہ جزئی دلائل ہیں، جن کا تعلق مخصوص مسائل سے اور جو عین حکم پر دلالت ہیں، جیسے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ (**النساء: ۲۳**) "تمہاری ماؤں کو تم پر حرام کیا گیا"، یہ آیت مخصوص مسئلہ ماؤں سے نکاح کی حرمت پر دلالت کررہی ہے، اسی طرح: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (**الحج: ۳۰**) "بتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو۔" کی آیت ہے، جو مخصوص مسئلہ بت پرستی اور جھوٹی گواہی کے حرام ہونے پر دلالت کررہا ہے۔

اس "تفصیلی دلائل" کے بالمقابل "اجمالی دلائل" ہیں، جن میں جزئی تفصیل نہیں ہوتی؛ بل کہ ان دلائل کے تحت متعدد جزئیات مندرج ہوتے ہیں، جیسے: امر وجوب کے لئے ہوتا ہے، اس کے تحت وہ تمام (اکثری) احکام درج ہوتے ہیں، جو صیغۂ امر کے ساتھ وارد ہوئے ہیں، اسی طرح: نہی حرمت کو بتانے کے لئے ہے، اس کے تحت صیغۂ نہی سے وارد ہونے والے تمام (اکثری) احکام درج ہوتے ہیں۔ (**الوجيز فی أصول الفقه للزحيلی، ص: ۱۳-۱۴**)

مقارن کے لغوی معنی

لفظ "**مُقارِن**" "قارَنَ يُقارِنُ مُقارَنَةً" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی "مقابلہ"، "موازنہ" اور "جوڑنے وجمع" کرنے کے آتے ہیں، **المعجم الوجیز** میں ہے: قارن الشئَ بالشئِ: وازنه به۔ (**المعجم الوجيز، ص: ۴۹۹، مادة: قرن، المعجم الوسيط، ص: ۷۳۰، مادة: قرن، لسان**

العرب: ۰ ۱ /۴۰ ۳۶ ۱ ، مادة: قرن)، اسی سے حج قران بھی ہے، جس کے معنی "عمرہ اور حج کے لئے نیت کے ساتھ یکبارگی تلبیہ" پڑھنے کے آتے ہیں۔(**الدر المختار مع ردالمحتار، کتاب الحج، باب القران: ۵۵۴/۳**)

فقہ مقارن کی اصطلاحی تعریف

اصطلاح میں فقہ مقارن اس علم کو کہتے ہیں، جس میں کسی بھی فقہی مسئلہ میں فقہاء کے اقوال و دلائل سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان اصولی طریقہ سے موازنہ کیا جائے اور بحث ونقاش کے بعد اختلاف کے منشاء کو واضح کرتے ہوئے راجح اور مرجوح کی نشاندہی کی جائے، احمد حسن خطیب لکھتے ہیں:

> اس سے مراد مختلف انواع وابواب کے شرعی احکام کا اس طور پر علم، جس میں علماء، ائمہ اور فقہاء کی آراء اور ان کے متفق علیہ یا مختلف فیہ مذاہب کی جان کاری، نیز ان کے اصولی قواعد اور دلائل اور ان نقاط نظر کی وضاحت ہو، جو اس اختلاف کا سبب بنے، ساتھ میں ان دلائل کا موازنہ اور لائق قبول اور قرین صواب کو اختیار کرنا بھی پایا جائے۔

فقہ اور فقہ مقارن کے درمیان فرق

فقہ اور فقہ مقارن کا علم اگرچہ کہ ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں؛ لیکن دونوں کے درمیان دو بنیادی فرق ہیں:

۱- علم فقہ کا موضوع احکام شرعیہ اور اس کے دلائل ہیں، جب کہ فقہ مقارن کا موضوع فقہاء اور مجتہدین کی آراء اور ان کے مابین موازنہ ہے۔

۲- فقہ مقارن میں مجتہدین کی آراء کو موازنہ کرتے ہوئے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دلائل کو ذکر کیا جاتا ہے، پھر بحث ونقاش کے بعد کسی ایک رائے کو ترجیح دی جاتی ہے، جب کہ فقہ میں صرف دلائل ذکر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، بحث ونقاش نہیں کیا جاتا، ہاں دوسرے فقہاء کی آراء بعض دفعہ ذکر کردی جاتی ہیں؛ لیکن ان کے درمیان موازنہ نہیں کیا جاتا اور نا ہی کسی کو ترجیح دی جاتی ہے۔(**دروس فی أصول الفقه المقارن لمجید النیسی، ص: ۲۵، ط: مرکز دراسات المصطفیٰ الدولی**)

فقہ مقارن کا موضوع

فقہ مقارن کا موضوع مجتہدین کے مختلف فیہ مسائل ہیں، جن کو ان کے دلائل اور سبب اختلاف کے

ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، پھران میں سے کسی ایک رائے کودلائل کی روشنی میں راجح قرار دیا جاتا ہے۔(**المدخل إلى الفقه المقارن للدكتور مسعود فلوسي ،ص: ۳،دروس في أصول الفقه المقارن لمجيد النيسي،ص: ۲۵،ط: مركز دراسات المصطفیٰ الدولي،الفقه المقارن، ص:۵۰، ط:الهيئة المصرية العامة لكتاب ۱۹۹۱**)

غرض وغایت

اس علم کی غرض یہ ہے کہ اہل علم کے درمیان جومختلف فیہ مسائل ہیں، ان میں اللہ کے حکم کے قریب پہنچنے کی مقدور بھر کوشش کی جائے۔(**المدخل إلى الفقه المقارن للدكتور مسعود فلوسي، ص: ۳**)

شرعی حیثیت

اس علم کا تعلق چوں کہ نفس احکام شرعی کی واقفیت سے نہیں؛ بل کہ تبحر (وسعت وکثرت علم) سے ہے اورظاہر ہے کہ ہر شخص پر یہ ضروری نہیں کہ وہ علم کا سمندر بن جائے؛ بل کہ ہر شخص کے لئے اتنے مسائل کا جاننا ضروری ہے، جن کا وہ مکلف ہے، اس اعتبار سے فقہ مقارن کے علم کے حصول کا درجہ مندوب ومستحب ہوگا، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

> **واعلم أن تعلم العلم يكون فرض عين، وهو بقدر مايحتاج لدينه، وفرض كفاية، وهو مازاد عليه لنفع غيره، ومندوبا، وهو التبحر في الفقه وعلم القلب۔(الدر المختار،المقدمة: ۱/۱۲۶-۱۲۵)**
>
> جاننا چاہئے کہ علم کا حصول کبھی فرض عین ہوتا ہے، اوروہ اس قدر ہے، جتنے کی دین کے لئے ضرورت ہو،کبھی فرض کفایہ ہوتا ہے، اوروہ اس (ضروری) سے زائد ہے، جودوسروں کی نفع رسانی کے لئے ہو، اورکبھی مندوب ہوتا ہے اوروہ علم قلب اورفقہ میں تبحر ہے۔

الموسوعة الفقهية میں ہے:

> **وقد يكون تعلم الفقه نافلة، وهو التبحر في أصول الأدلة والإمعان فيماوراء القدر الذي يحصل به فرض الكفاية۔ (الموسوعة الفقهية: ۱۹۵/۳۲،لفظ: فقه)**
>
> اوربعض دفعہ فقہ کا حصول نفل ہوتا ہے اوروہ اصول ادلہ میں تبحر اوراس مقدار سے

زائد میں امعان ہے، جس سے فرض کفایہ حاصل ہوتا ہے۔

فقہ مقارن کے فوائد

اس علم کے سیکھنے کے درج ذیل فائدے ہیں:

۱- **علم میں وسعت اور رسوخ:** فقہ مقارن میں فقہاء کے اقوال، اسباب اختلاف، دلائل اور طریقۂ استدلال سے واقفیت حاصل کی جاتی ہے، پھر ان میں موازنہ اور مناقشہ کے ذریعہ سے کسی ایک رائے کو راجح قرار دینے کا عمل بھی ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے علم میں وسعت اور رسوخ پیدا ہوتا ہے، امام نوویؒ لکھتے ہیں:

> **واعلم أن معرفة مذاهب السلف بأدلتهامن أهم مايحتاج إليه؛ لأن اختلافهم فی الفروع رحمة، وبذكرمذاهبهم بأدلتهايعرف المتمكن المذاهب علی وجهها، والراجح من المرجوح، ويتضح له ولغيره المشكلات، وتظهرله الفوائدالنفيسات، ويتدرب الناظرفيهابالسؤال والجواب، ويتفتح ذهنه ويتميزعندذوی البصائروالألباب، ويعرف الأحاديث الصحيحةمن الضعيفة، والدلائل الراجح من المرجوحة، ويقوم بالجمع بين الأحاديث والمتعارضات، والمعمول بظاهرهامن المؤولات، ولايشكل عليه إلاأفرادمن النادر۔**

(المجموع، المقدمة: ۱/ ۱۹)

> جاننا چاہئے کہ دلائل کے ساتھ اسلاف کے مذاہب کی واقفیت اہم ترین ضرورت ہے؛ کیوں کہ فروعات میں ان کا اختلاف رحمت ہے، اور دلائل کے ساتھ ان کے مذاہب کے ذکر کرنے سے براہ راست مذاہب اور مرجوح کے بالمقابل راجح سے واقفیت ہوجاتی ہے، اور اس کے اور دوسروں کے سامنے پیچیدگیاں واضح ہوتی ہے، نفسیاتی فوائد ظاہر ہوتے ہیں، اور سوال جواب کے ذریعہ سے غور وفکر کی تربیت ہوتی ہے، ذہن کھلتا ہے اور اہل دانش وبینش کے نزدیک وہ ممتاز رہتا ہے، ضعیف کے مقابلہ میں صحیح احادیث اور مرجوح کے مقابلہ میں راجح کی جان کاری ہوتی ہے، متعارض اور احادیث کے درمیان، نیز مؤلات کے بالمقابل معمول بہا کے درمیان تطبیق دے سکتا ہے اور کم ہی لوگ اس پر اشکال کر سکتے ہیں۔

۲- **جمود اور مسلکی تعصب سے چھٹکارہ:** کسی طالب علم کی نظر جب کسی مسئلہ میں فقہائے کرام کے اقوال مع دلائل اور طرق استدلال پر پڑتی ہے تو اس سے جمود اور بے جا مسلکی تعصب سے پاک ہوکر فراخ دلی

کا ثبوت دیتا ہے، ہر ایک کی رائے کو قابل احترام سمجھتا ہے اور وقت ضرورت اس سے استفادہ بھی کرتا ہے۔

۳- **دلائل کی قوت اور ضعف سے واقفیت:** اس علم کی برکت سے طالب علم مختلف فیہ مسائل کے صرف دلائل سے ہی واقف نہیں ہوتا ہے؛ بل کہ ان کی قوت اور ضعف سے بھی واقف ہوتا ہے، جس کی روشنی میں کتاب وسنت سے قریب تر مسئلہ پر عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ (**مسائل فی الفقه المقارن للكتور عمر سليمان الأشقر وغيره، ص: ۱۴-۱۳، ط: دار النفائس، اردن**)

۴- **فقہ اسلامی کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش:** طالب علم اس علم کے ذریعہ سے سہل اور آسان طریقہ سے فقہ اسلامی کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے، جو عادتاً مختلف نظریات کو سامنے رکھنے اور موضوعی بنیاد پر ان کی قدر وقیمت کا اندازہ لگانے کے بعد ہی واضح ہوتا ہے۔

۵- **مسلکی اختلاف کی حد بندی اور مسلکی انتشار پر روک:** اس کے ذریعہ سے مسلکی اختلاف کی حد بندی ہوتی ہے اور ملت اسلامیہ کے مابین اس مسلکی انتشار پر روک لگ جاتی ہے، جو دراصل دوسرے مسالک کی بنیاد اور دلائل سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ (**دروس فی أصول الفقه المقارن لمجيد النيسی، ص: ۲۵، ط: مركز دراسات المصطفیٰ الدولی**)

۶- **پیش آمدہ مسائل کے حل میں تعاون:** فقہ مقارن طالب علم کو اجتہاد، علمی جستجو اور تحقیق پر ابھارتا ہے، جس کی وجہ سے پیش آمدہ مسائل کے حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

۷- **طریقۂ استنباط واجتہاد سے واقفیت:** فقہائے کرام اور مجتہدین کے طریقۂ استنباط واجتہاد سے واقفیت ہوتی ہے۔

۸- **اطمینان قلب کا حصول:** مختلف فیہ مسائل میں اکثر وبیشتر طالب علم الجھ جاتا ہے؛ لیکن مقارنہ کے ذریعہ اسے اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ (**مسائل فی الفقه المقارن للكتور عمر سليمان الأشقر وغيره، ص: ۱۴-۱۳، ط: دار النفائس، اردن**)

۹- **دین کی آسانی کا علم:** فقہ مقارن کے ذریعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین بہت آسان اور سہل ہے اور انسان اگر چاہے تو آسانی کے ساتھ اپنی پوری زندگی کو اسلامی بنا سکتا ہے۔

۱۰- **جہالت سے چھٹکارا:** فقہ مقارن کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس جہالت سے چھٹکارہ مل جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں ائمۂ متبوعین پر طعن وتشنیع کی جاتی ہے؛ کیوں کہ جب ایک شخص کی نظر مسائل کے طریقۂ استنباط پر پڑتی ہے، پھر دلائل پر غور کرتا ہے اور ادلہ کے درمیان مناقشہ کرتا ہے تو اسے اپنی جہالت سے

واقفیت ہوتی ہے اور علم کا غرہ جاتا رہتا ہے۔(**محاضرات فی الفقه المقارن لسعید رمضان البوطی، ص: ٦، ط: الفکر المعاصر، بیروت**)

فقہ مقارن کے مباحث

فقہ مقارن کے اندر جن چیزوں سے بحث کی جاتی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

۱- فقہی احکام، خواہ متفق علیہ ہوں یا مختلف فیہ۔

۲- فقہی احکام کے مآخذ۔

۳- ادلہ اور ان کی اسانید کا دراسہ۔

۴- قوت وضعف کے اعتبار سے ادلہ کا موازنہ۔

۵- آیات واحادیث احکام کا دراسہ۔

۶- فقہی قوانین ومبادی اور وضعی قوانین کا دراسہ۔

۷- فقہی احکام اور وضعی احکام کے مابین موازنہ —— انہیں تمام امور سے فقہ مقارن میں بحث کی جاتی ہے۔(**الفقه المقارن، ص: ۵۱**)

فقہ مقارن اور علم الخلاف

فقہ مقارن کی جو تعریف پیچھے ذکر کی گئی ہے، وہ جدید تعریف ہے، قدیم دور میں اس کو ''علم الخلاف'' یا ''خلافیات'' کے نام سے جانا جاتا تھا، نیز اس کا موضوع بھی چوں کہ مجتہدین کے مختلف فیہ مسائل ہیں؛ اس لئے اختلاف اور اس کی حقیقت کا جاننا بھی ضروری ہے۔

خلاف کے لغوی معنی

خلاف مصدر ہے خالف یخالف مخالفۃً کا، جس کے معنی ''مخالفت'' اور ''عدم اتفاق'' کرنے کے آتے ہیں، **المعجم الوجیز** میں ہے: خالف الشئی: ضادہ۔ (**المعجم الوجیز، ص: ۲۰۸، لفظ: خلف، المعجم الوسیط، ص: ۲۵۱**)

لغوی اصطلاح میں خلاف ایسے جھگڑے کو کہتے ہیں، جو حق کی تحقیق یا باطل کے ابطال کے لئے دو یا اس سے زائد لوگوں کے درمیان ہو، قطب مصطفی سانو کہتے ہیں:

منازعة تجری بین متعارضین فأکثر لتحقیق حق أو لإبطال باطل۔ (**معجم مصطلحات أصول الفقه لقطب مصطفی سانو، ص: ۱۹۸، ط: دار الفکر المعاصر، بیروت**)

ایسا جھگڑا، جو ابطال باطل یا احقاق حق کے لئے دو یا اس سے زیادہ افراد کے درمیان جاری ہو۔

خلاف کے اصطلاحی معنی

اصطلاح میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

هوعلم يعرف به كيفية إيرادالحجج الشرعية، ودفع الشبه وقوادح الأدلة الخلافية بإيراد البراهين القطعية۔ (ابجدالعلوم لصديق حسن القنوجي: ۲/۲۷۶، ط: منشورات وزارة الثقافة والإرشاد القومي، دمشق ۱۹۷۸ء)

ایسا علم، جس کے ذریعہ سے شرعی دلائل لانے کی کیفیت اور قطعی دلائل لاکر اختلافی دلائل کی خرابیاں اور شبہات کو دور کرنے کی کیفیت معلوم ہو۔

فقہ خلاف کی نشوونما

محققین کی رائے یہ ہے کہ اس کا آغاز خلافت عباسیہ میں ہوا (جس کی مدت ۱۳۲ھ(۷۵۰ء) سے ۶۵۶ھ(۱۲۵۸ء) ہے)؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں صرف جمع اقوال کا آغاز تھا، مناقشہ کے ساتھ ساتھ دلائل کا ذکر اوران کے درمیان ترجیحی عمل کی ابتدا مذاہب اربعہ کی توسیع کے ساتھ ہوا، جب کہ ہر مذہب کے فقہاء نے اپنے مذہب کی تائید کے طور پر اختلافی مسائل کے نہ صرف دلائل پیش کئے؛ بل کہ اپنے مخالف کے دلائل کا رد بھی کیا، ابن خلدونؒ لکھتے ہیں:

فاعلم أن هذا الفقه المستنبط من الأدلة الشرعية كثرفيه الخلاف بين المجتهدين باختلاف مداركهم وأنظارهم خلافاً لابدمن وقوعه لماقدمناه، واتسع ذلک في الملة اتساعاً عظيماً، وكان للمقلدين أن يقلدوا من شاء وامنهم، ثم لماانتهى ذلک إلى الأئمةالأربعةمن علماء الأمصار، وكانوا بمكان من حسن الظن بهم اقتصرعلى تقليدهم ومنعوا من تسليدسواهم لذهاب الاجتهادلصعوبته وتشعب العلوم التي هي موادہ باتصال الزمان وافتقادمن يقوم على سوى هذه المذاهب الأربعة، فأقيمت هذه المذاهب الأربعة أصول الملةوأجرى الخلاف بين المتمسكين بها والآخذين بأحكامها مجرى الخلاف في النصوص الشرعية والأصول الفقهية، وجرت بينهم المناظرات في تصحيح

كل منهم مذهب إمامه تجري على أصول صحيحة وطرائق قويمة يحتج بها كل على صحة مذهبه الذي قلده وتمسک به، وأجريت في مسائل الشريعة كلها في كل باب من أبواب الفقه، فتارة يكون الخلاف بين الشافعي ومالک، وأبوحنيفة يوافق أحدهما، وتارة بين مالک وأبي حنيفة، والشافعي يوافق أحدهما، وتارة بين الشافعي وأبي حنيفة، ومالک يوافق أحدهما، وكان هذه المناظرات بيان مآخذهؤلاء الأئمة ومثارات اختلافهم ومواقع اجتهادهم، كان هذاالصنف من العلم يسمى بالخلافيات۔

(مقدمة ابن خلدون: ۱/۵۷۷-۵۷۸، ط: دار الفکر، بیروت ۲۰۰۱ء)

جاننا چاہئے کہ ادلہ شرعیہ سے مستنبط اس فقہ میں مجتہدین کے مختلف خیالات اوران کے متفرق نظریات کی وجہ سے کثرت سے اختلاف پایا جاتا ہے، جس کا وقوع ضروری (بھی) ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا، اور مذہب میں اس کا بہت زیادہ پھیلاؤ ہوا، اور مقلدین کے لئے گنجائش تھی کہ ان میں سے جس کی چاہیں، تقلید کریں، پھر جب علمائے امصار میں سے ائمہ اربعہ پر یہ ختم ہواتوان کے ساتھ حسن ظن کی وجہ سے لوگوں نے انھیں کی تقلید پر اکتفا کیا اوراجتہاد کی دشواری، زمانہ کی مناسبت سے علوم کی کثرت اور مذاہب اربعہ کو قائم کرنے والوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کے علاوہ دوسروں کی تقلید سے انھوں نے منع کیا، پس ان مذاہب اربعہ کواصول مذہب قرار دیا گیااور فقہی اصول اورشرعی نصوص میں اختلاف کی وجہ سے ان مذاہب کے ماننے والوں اوران (کے بتائے ہوئے) احکام کواختیار کرنے والوں کے مابین اختلاف جاری رہا، ان کے درمیان اپنے امام کے مذہب کی تصحیح کے تعلق سے مناظرے ہوئے، جوان صحیح اصولوں اور درست دلیلوں کے مطابق ہوتے، جن سے ان کے ائمہ نے اپنے مذہب کی صحت پر استدلال کیا ہے اور یہ تمام ابواب فقہ کی بابت شرعی مسائل میں ہوتے، پس کبھی شافعی اور مالک کے درمیان اختلاف ہوتا اورابوحنیفہ ان میں سے کسی کے موافق ہوتے اور کبھی مالک اورابوحنیفہ کے مابین ہوتا اورشافعی ان میں سے ایک کے موافق ہوتے اور کبھی شافعی اورابوحنیفہ کے درمیان ہوتا اور مالک کسی ایک موافق ہوتے، یہ مناظرے ان ائمہ کے مآخذ، ان کے اختلاف کے اسباب اوران کے

اجتہاد کے مواقع کی وضاحت ہوتے، علم کے اس صنف کو'خلافیات' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

علم خلاف کا موجد

سب سے پہلے اس 'علم خلاف' کو کس شخص نے بیان کیا؟ اس سلسلہ میں ابوزید دبوسی (م: ۴۳۲ھ) کا نام نامی لیا جاتا ہے، نواب صدیق حسن قنوجیؒ لکھتے ہیں:

واعلم أن أول من أخرج علم الخلاف في الدنيا أبو زيد الدبوسي المتوفى سنة ۴۳۲ من الهجرة، وهو ابن ثلاث وستين۔ (**ابجد العلوم: ۲/۲۷۸، ط: منشورات وزارة الثقافة والإرشاد القومي، دمشق ۱۹۷۸ء**)

اور جان لینا چاہئے کہ دنیا میں سے سب سے پہلے علم خلاف کی تخریج ابوزید دبوسی نے کی، جن کی وفات ۴۳۲ ہجری میں ہوئی، جب کہ وہ تریسٹھ سال کے تھے۔

خلاف اور اختلاف

خلاف ہی کی طرح ایک لفظ'' اختلاف'' ہے، اس کا استعمال بھی کثرت سے ہوتا ہے اور عموماً دونوں ہم معنی ہی مستعمل ہوتے ہیں، اس لفظ کے بارے میں بھی جانتے چلیں۔''اختلاف''مصدر ہے 'اختلف یختلف' کا، جو'اتفق یتفق' کی ضد ہے، اس کے معنی''متفق اور برابر نہ ہونے'' کے ہیں، **المعجم الوسیط** میں ہے:

(اختلف) الشيئان: لم يتفقا، ولم يتساويا۔ (**المعجم الوسيط، ص: ۲۵۱**، نیز دیکھئے: **المصباح المنير، ص: ۱۰۰، لفظ: خلف**) اختلف الشيئان: یعنی غیر متفق اور غیر برابر ہونا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلاَ تَكُونُواْ كَالَّذِينَ تَفَرَّقُواْ وَاخْتَلَفُواْ مِن بَعْدِ مَا جَاءهُمُ الْبَيِّنَاتُ۔ (آل عمران: ۱۰۵)

تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو، جو لوگ بٹ گئے اور جنھوں نے کھلی ہوئی نشانیاں آنے کے بعد اختلاف کیا۔

دو چیزوں کے درمیان عدمِ تساوی اور اتفاق نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی جس روش پر چل رہا ہے، دوسرا آدمی اس کے برخلاف روش پر چلے، یہی وجہ ہے کہ امام راغب اصفہانیؒ نے 'اختلاف' کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

الاختلاف والمخالفة: أن یأخذ کل واحد طریقا غیر طریق الآخر فی حالہ وقولہ۔ (مفردات القرآن، کتاب الخاء:۲۰۷، نیز دیکھئے: الفروق اللغویۃ، الفرق بین الاختلاف فی المذاهب، فرق نمبر:۷۹: ۱/۲۸)

اختلاف اور مخالفت یہ ہے کہ ہر شخص حال چال یا بات چیت میں دوسرے شخص کے راستے سے ہٹ کر چلے۔

اہل علم کے نزدیک یہ لفظ حقیقتاً لغوی معنی میں ہی مستعمل ہے (**الموسوعة الفقهية، لفظ: اختلاف: ۲/۲۹۱**)؛ البتہ 'اختلاف' چوں کہ کسی دلیل کے پیش نظر ہوا کرتا ہے؛ اس لئے اختلاف کے لغوی معنی میں تھوڑی وسعت دی گئی اور 'کسی دلیل پر مبنی قول' کو اختلاف کہا جانے لگا، علامہ محمد علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

والاختلاف فی مصطلح أهل العلم یستعمل فی قول بنی علی دلیل۔ (کشاف اصطلاحات الفنون: ۲/۲۳۰)

لفظ 'اختلاف' اہل علم کی اصطلاح میں کسی دلیل پر مبنی قول کے لئے مستعمل ہوتا ہے، خلاف اور اختلاف میں فرق یہ ہے کہ اختلاف اور خلاف دونوں اگرچہ معنوی اعتبار سے ہم معنی ہیں، تاہم اہل لغت نے کچھ فرق بھی بتائے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱- اختلاف میں منزل اور مقصود تو ایک ہوتا ہے؛ البتہ راستے مختلف ہوتے ہیں۔
۲- اختلاف کسی دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے، جب کہ خلاف کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔
۳- اختلاف رحمت کے آثار میں سے ہے، جب کہ خلاف بدعت کے آثار میں سے ہے۔
۴- اگر قاضی کسی خلافی قول پر فیصلہ کردے اور دوسرے کے سامنے اس فیصلہ کا مرافعہ کیا جائے تو اس کے فیصلہ کا فسخ جائز ہے، جب کہ اختلافی قول پر کئے ہوئے فیصلہ کا فسخ درست نہیں۔ (**الکلیات للکفوی، فصل الألف والخاء: ۱/۲۷، الدرالمختار، مطلب: یوم الموت لایدخل تحت القضاء: ۵/۴۰۳**)—— خلاف اور اختلاف کے درمیان یہ فرق اس لئے ہے کہ خلاف کا مدار کسی دلیل پر نہیں ہوتا؛ بل کہ یہ نزاع اور شقاق پر مشتمل ہوتا ہے، لہٰذا یہ حقیقی اختلاف ہے، جب کہ اختلاف کا مدار کسی دلیل پر ہوتا ہے اور اس کے اندر نزاع اور شقاق کا عمل دخل نہیں ہوتا، لہٰذا یہ لفظی اختلاف ہے۔

اختلاف ایک ناگزیر ضرورت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام انسانوں کو مختلف المزاج بنایا ہے، جس کی ابتدا نطفہ ہی سے ہوگئی ہے، اللہ

تعالیٰ تخلیقِ انسانی کو بتاتے ہوئے فرماتا ہے:

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً۔ **(الدھر: ۲)**

ہم نے انسان کو نطفۂ مخلوط سے پیدا کیا؛ تاکہ اسے آزمائیں تو ہم نے اس کو سنتا دیکھتا بنایا۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام طبرانیؒ لکھتے ہیں:

> **یعنی نسل آدم، خلقه الله من نطفة أمشاج، أی: أخلاط، واحدها: مشیج، وهو شیئان مخلوطان، یعنی اختلاط نطفة الرجل بنطفة المرأة، أحدهما: أبیض، والأخر: أصفر، فما کان من عصب وعظم وقوة فمن نطفة الرجل، وما کان من لحم ودم وشعر فمن نطفة المرأة۔ (القرآن العظیم للإمام الطبرانی: ۱۰/ ۲۵۷)**
>
> یعنی نسل آدم، اللہ نے اسے مخلوط نطفہ سے پیدا کیا، اس **(أمشاج)** کا واحد **مشیج** ہے، جس کے معنی دو مخلوط چیز کے ہیں، یعنی عورت کے نطفہ سے مرد کے نطفہ کا اختلاط، ان میں سے ایک سفید ہوتا ہے اور دوسرا زرد، تو پٹھا، ہڈی اور قوت مرد کے نطفہ سے، جب کہ گوشت، خون اور بال عورت کے نطفہ سے ہوتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ تخلیقِ انسانی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ ساتھ مرد وعورت کے نطفہ کا کافی دخل ہوتا ہے، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بقول: مرد کا نطفہ سفید اور گاڑھا ہوتا ہے، جب کہ عورت کا نطفہ زرد اور سیال ہوتا ہے۔ **(صحیح مسلم، باب وجوب الغسل علی المرأة بخروج المنی منها،** حدیث نمبر: ۳۱۱)، اب ظاہر ہے کہ جب نطفہ میں یہ فرق ہے تو اس سے وجود میں آنے والی شئ میں بدرجۂ اولیٰ فرق رہے گا؛ چنانچہ اس آیت کی ایک تفسیر ''طبائع انسانی میں فرق'' سے بھی کی گئی ہے، مشہور مفسر علی بن محمد خازنؒ (م: ۷۴۱ھ) لکھتے ہیں:

> **وقیل: إن الله تعالیٰ جعل فی النطفة أخلاطاً من الطبائع التی تکون فی الإنسان من الحرارة، والبرودة، والرطوبة، والیبوسة، فعلی هذا یکون التقدیر: من نطفة ذات أمشاج۔ (تفسیر الخازن: ۶/ ۳۳۴، ط: دارالکتب العلمیة، بیروت)**
>
> اور کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے نطفہ کو ان طبائع کا مخلوط بنایا ہے، جو انسان میں ہوتے ہیں،

یعنی حرارت، برودت، رطوبت اور یبوست (خشکی)، پس اس کی تقدیر مخلوط نطفہ سے ہوگی۔

مذکورہ تفسیر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ انسانی طبیعتوں میں فرق اللہ کی جانب سے ودیعت کی گئی ہے، جن میں مکمل طور پر یکسانیت کی تلاش تحصیل حاصل ہے، پھر یہ اختلاف صرف انسانوں میں ہی نہیں؛ بل کہ اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوقات میں بھی ہے، قرآن مجید میں ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰہَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفاً أَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ★ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰہَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاء إِنَّ اللّٰہَ عَزِيزٌ غَفُورٌ۔ (فاطر: ۲۷-۲۸)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے مینہ برسایا تو ہم نے اس سے طرح طرح کے رنگوں کے میوے پیدا کئے اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں اور (بعض) کالے سیاہ ہیں☆ انسانوں اور جانوروں اور چار پایوں کے بھی کئی طرح کے رنگ ہیں اللہ سے تو اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو صاحبِ علم ہیں بیشک اللہ غالب (اور) بخشنے والا ہے۔

لہٰذا یہ تصور سے باہر کی چیز ہے کہ روئے زمین پر آباد تمام انسانوں میں عقائد وعبادات، اخلاق وسلوک، افکار وتصورات، فہم وادراک، تہذیب وثقافت، عادات ورسوم اور تحمل وبرداشت کے لحاظ سے یکسانیت پائی جائے، قرآن مجید کی کئی آیتوں میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱۔ **لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجاً۔ (المائدۃ: ۴۸)** ''ہم نے تم میں سے ہر ایک (فرقے) کیلئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے''۔

علامہ رشید رضا مصریؒ اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

لكل أمة منكم أيها المسلمون والكتابيون أو أيها الناس جعلنا شريعة أوجبنا عليهم إقامة أحكامها، وطريقا للهداية فرضنا عليهم سلوكه لتزكية أنفسهم وإصلاحها، لأن الشرائع العملية وطرق التزكية الأدبية تختلف باختلاف أحوال الاجتماع واستعداد البشر۔ (تفسير المنار: ۶/ ۳۴۱)

اے مسلمانو اور اے کتابیو! یا اے لوگو! تم میں سے ہر ایک امت کے لئے ہم نے ایک

دستور بنایا ہے اوراس کے احکام کی بجا آوری کو ہم نے ان پر واجب کیا ہے، اور ہدایت کے لئے راستہ بنایا ہے، جس پر چلنے کو نفس کے تزکیہ اوراس کی اصلاح کے لئے ہم نے ان پر فرض کیا ہے؛ عملی شریعتیں اور اخلاقی تزکیہ کے طریقے اجتماعی احوال اور انسانی استعداد کے اختلاف سے مختلف ہوتے ہیں۔

۲-وَلَوْ شَاءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلاَيَزَالُونَ مُخْتَلِفِيْنَ۔(هود: ۱۱۸)’’اوراگر تمہارا رب چاہتا تو تمام لوگوں کوایک ہی جماعت کر دیتا؛لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے‘‘۔

تفسیر شعراوی میں اس کی توضیح اس طرح کی گئی ہے:

أی: أن الله تعالی لم یجعل الناس امة واحدة؛ بل جعلهم مختلفین۔ (تفسیر شعراوی: ۱۱/۶۷۶۰)

یعنی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کوایک امت نہیں بنایا؛بل کہ انھیں مختلف بنایا ہے۔

۳-هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنکُمْ کَافِرٌ وَمِنکُم مُّؤْمِنٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِیْرٌ ۔(التغابن: ۲)’’وہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مومن اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے‘‘۔

قاضی بیضاویؒ اس کی توضیح میں لکھتے ہیں:

(هو الذی خلقکم فمنکم کافر) مقدر کفره موجه إلیه مایحمله علیه (ومنکم مؤمن) مقدر إیمانه موفق لمایدعوه إلیه۔ (تفسیر البیضاوی: ۱/۳۴۴)

(اسی نے تمھیں پیدا کیا، پس تم میں سے کوئی کافر ہے)،جس کا کفر پوشیدہ ہے اوراس کی طرف متوجہ کرنے والا ہے،جس پر اس کو محمول کیا ہے، اور(کوئی مؤمن ہے)،جس کا ایمان پوشیدہ ہے اوراس کو اس چیز کی توفیق ملنے والی ہے،جس کی طرف اسے دعوت دی گئی ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

> أی: هو الخالق لکم علی هذه الصفة وأراد منکم ذلک، فلابد من وجود مؤمن وکافر۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱۴/۱۷)
>
> یعنی: وہی اس صفت پر تم کو پیدا کرنے والا ہے اور تم سے اس کا ارادہ بھی کیا ہے، لہٰذا مؤمن اور کافر کا وجود ضروری ہے۔
>
> ۴-﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ

دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ﴾ [الزخرف:32]

''ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے؛ تا کہ ایک دسرے سے خدمت لے''۔

اس آیت کی تفسیر میں علی بن احمد واحدیؒ لکھتے ہیں:

ليسخر الأغنياء بأموالهم الفقراء ويستخدموهم فيكون بعضهم لبعض سبب المعاش فی الدنيا هذا بماله وهذابأعماله۔ (الوجيز فی تفسير الكتاب العزيز: ۹۷۳/۱)

تا کہ مالدار لوگ اپنے مال کی وجہ سے فقراء کو تابع بنائیں اور ان سے خدمت لیں، پس بعض، بعض کے لئے دنیا میں معاش کا سبب بنیں، یہ مال کے ذریعہ سے اور وہ اعمال کے ذریعہ سے۔

مزید وضاحت مشہور مفسر علی بن محمد خازنؒ کی عبارت سے ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

يعني لوأنناسوينا بينهم في كل الأحوال لم يخدم أحد أحداً ولم يصر أحدمنهم مسخراً لغيره، وحينئذ يقضي ذلك إلى خراب العالم وفساد حال الدنيا، ولكنا فعلنا ذلك ليستخدم بعضهم بعضاً، فتسخر الأغنياء بأموالهم الأجراء الفقراء بالعمل، فيكون بعضهم لبعض سبب المعاش، فهذا بماله وهذابعمله، فيلتئم قوام العالم۔ (تفسیر الخازن: ۱۳۴/۶)

یعنی اگر ہم ان کے درمیان تمام حالتوں میں برابر کر دیتے تو کوئی کسی کی خدمت نہیں کرتا اور نا ہی ان میں سے ایک دوسرے کے تابع ہوتا، اور یہ اس وقت دنیا کی ویرانی اور اس کی حالت کے بگاڑ تک لے جاتا؛ لیکن ہم نے ایسا اس لئے کیا؛ تا کہ بعض، بعض کی خدمت کریں، پس مالدار اپنے مال کے ذریعہ سے فقیر مزدور کو کام کے لئے مسخر کریں، پس بعض، بعض کے لئے دنیا میں معاش کا سبب بنیں، یہ مال کے ذریعہ سے اور وہ اعمال کے ذریعہ سے، اور اس طرح دنیا کا نظام درست رہے۔

مذکورہ تمام آیات اوران کی توضیحات سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہوگئی کہ انسانوں کے درمیان اختلاف ایک ناگزیرشیٔ ہے،علامہ ابن قیمؒ رقم طراز ہیں:

وقوع الاختلاف بین الناس أمرضروری، لابد منه، لتفاوت أغراضهم وأفهامهم وقوی إدراکهم۔ (الصواعق المرسلة: ۵۱۹/۲، اعلام الموقعین:۳۶۵/۳)

لوگوں کے درمیان اختلاف کاواقع ہونافہم وادارک اوراغراض میں فرق ہونے کی وجہ سےایک ضروری چیز ہے،جس سے چھٹکارہ نہیں۔

مذکورہ سطور سے یہ معلوم ہوگیاہوگا کہ اختلاف ایک ناگزیرامر ہے،جوفطری اورتقدیری ہے،اس سے کسی کومفرنہیں۔

اختلاف کی قسمیں

بنیادی طور پراختلاف کی دوقسمیں ہیں:

۱- اختلاف محمود۔

۲- اختلاف مذموم۔

اختلاف محمود

جواختلاف پسندیدہ اورلائق قبول ہے، وہ علماء اورفقہاء کے مابین فہم نصوص کی وجہ سے پیداشدہ اختلاف ہے؛ کیوں کہ بعض نصوص ظنی الثبوت ہوتے ہیں، جب کہ بعض ظنی الدلالہ، اب ظاہرہے کہ ایسی صورت میں اختلاف کاپیداہوناامربعیدنہیں ہے،اسی لئے اختلاف محمودکی تعریف یوں کی گئی ہے:

هوالخلاف الناتج بسبب اختلاف العلماء فی فهم و تفسیرالنصوص الشرعیة الظنیةالثبوت، أوالظنیة الدلالة، أوبسبب اختلاف العلماء فی استنباط الأحكام الشرعیة من النصوص المجملة۔ (الاعتدال والوسطیة لشرح العقیدة الطحاویة، الفصل الثانی، المبحث: حقیقة الإسلام:۴۷۷/۲)

(اختلاف محمود) وہ اختلاف ہے، جوظنی الدلالہ یاظنی الثبوت نصوص شرعیہ کی تفسیر کےسمجھنے، یامجمل نصوص سےاحکام شرعیہ کومستنبط کرنے میں علماء کےاختلاف کےسبب سے پیداہو۔

اختلاف محمود کی صورتیں

اختلاف محمود کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱- اختلاف تنوع: اس سے مراد وہ اختلاف ہے، جوحق کے حدود میں رہتے ہوئے فہم نص اور دلالت نص کے سلسلہ میں پایا جاتا ہے، یہ اختلاف اس امت کے لئے رحمت ہے؛ کیوں کہ ہر ایک کا مقصد حق تک پہنچنا ہوتا ہے، جیسے: اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

إذاأقيمت الصلاة، فلاصلاة إلاالمكتوبة۔(صحيح مسلم حدیث نمبر: ۷۱۰)

جب نماز قائم ہوجائے تو فرض کے علاوہ کوئی نماز درست نہیں۔

بعض حضرات نے اس سے یہ سمجھا کہ اگر کوئی شخص پہلے سے نماز میں تھا اور نماز قائم ہوگئی تو اب اس کی وہ نماز باطل ہوجائے گی، جب کہ بعض نے اس کا مفہوم یہ لیا کہ اس سے مراد نئی نماز کا آغاز کرنا ہے، پہلے سے اگر نماز میں ہے تو وہ نماز درست ہوجائے گی۔(دیکھئے: **العرف الشذی للکشمیری: ۱/۳۹۷، المفهم لماأشكل من تلخيص كتاب مسلم، باب إذاأقيمت الصلاة فلاضلاة إلاالمكتوبة،** حدیث نمبر: ۲۹۹)

۲- اجتہادی اختلاف: اس سے مراد وہ اختلاف ہے، جو ایسے مجتہد فیہ مسائل میں ہو، جن کی بابت نہ تو کتاب وسنت کی کوئی نص موجود ہو اور نا ہی اس سلسلہ میں امت کا اجماع ہوا ہو۔(**الاعتدال والوسطية لشرح العقيدة الطحاوية لصلاح الدين عطية السبعاوی: ۲/۴۷۹-۴۷۷، ط: دارالكتب العلمية، بيروت ۱۹۷۱ء**)

اختلاف مذموم

اختلاف محمود کے مقابلہ میں اختلاف مذموم ہے، جو اعتقاد، یا عمل یا قول میں ہوا کرتا ہے، اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

> والاختلاف المحرم والمذموم هوالخلاف الذی يخرج صاحبه عن الثوابت الشرعية والمسلمات الإيمانية من اعتقاد، أوقول، أو عمل ۔
> **(الاعتدال والوسطية لشرح العقيدة الطحاوية : ۲/۴۷۵)**
> حرام اور مذموم اختلاف وہ ہے، جس میں اختلاف کرنے والا عمل، یا قول، یا اعتقاد میں سے ایمانی مسلمات اور شرعی طور پر ثابت شدہ امور سے باہر نکل جائے۔

اختلاف مذموم کی صورتیں

اختلاف مذموم کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱- اصول دین میں اختلاف: اس سے مراد وہ اختلاف ہے، جو دین کے اصول میں سے کسی اصل (عقیدہ) یا دین کے کسی ایسے ظاہر اور متواتر حکم میں ہو، جو عوام وخواص کے درمیان مشہور ہو اور جس پر علماء کا اجماع قطعی ہو چکا ہو (**نواقض الإيمان القولية والعملية، ص: ۲۴۲**)، جیسے: اللہ کے وجود، اس کی وحدانیت، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، آخرت کے دن اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھائے جانے پر ایمان کہ ان امور میں اختلاف کی گنجائش نہیں، اس میں اختلاف کا نتیجہ کفر ہے، اسی طرح اسلام کے بنیادی ارکان، اعمال خیر اور مکارم اخلاق، نیز اعمال فجور اور برے اخلاق، جیسے: شراب اور نشہ آور چیزیں اور ناحق کسی کو قتل کرنا وغیرہ میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے، اگر ان میں اختلاف ہو تو یہ اختلاف مذموم ہے، امام ابواسحاق شیرازیؒ لکھتے ہیں:

> **فأما مالايسوغ فيه الاجتهاد، فعلى ضربين: أحدهما: ماعلم من دين الرسول ﷺ ضرورة كالصلوات المفروضة، والزكوات الواجبة، وتحريم الزنا، واللواط، وشرب الخمر و غير ذلك، فمن خالف في شئي من ذلك بعدالعلم، فهو كافر؛ لأن ذلك معلوم من دين الله تعالىٰ ضرورة، فمن خالف فيه، فقد كذب الله تعالىٰ ورسوله في خبرهما، فحكم بكفره۔**
>
> **(اللمع، ص: ۱۳۰-۱۲۹، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)**
>
> جہاں تک ان احکام کا تعلق ہے، جن میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہوتی تو ان کی دو قسمیں ہیں:
>
> ایک: رسول اللہ ﷺ کے دین میں سے جس کا جاننا ضروری اور لازمی ہو، جیسے: فرض نمازیں، واجب زکات، زنا، لواطت اور شراب نوشی کی حرمت وغیرہ، تو جو شخص ان چیزوں سے واقف ہونے کے بعد ان کی مخالفت کرے تو وہ کافر ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں سے ان کا علم ہر حال میں ضروری ہے، لہٰذا جو اس کی مخالفت کرے، گویا اس نے اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کو جھٹلایا، پس اس پر کفر کا حکم لگایا جائے گا۔

۲- قطعی الدلالہ نصوص میں اختلاف: اس سے مراد وہ اختلاف ہے، جو ایسے ثابت شدہ اجماع یا نصوص قطعیہ میں واقع ہو، جن میں اجتہاد کی گنجائش نہیں، علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں:

فأماالقطعی: فلامجال للنظرفیه بعدوضوح الحق فی النفی، أوفی الإثبات، ولیس محلاللاجتهاد، وهوقسم الواضحات؛ لأنه واضح الحکم حقیقة، والخارج عنه مخطئ قطعاً۔ **(الموافقات، المسألة الرابعة من الاجتهاد: ۱۱۵/۵)**

جہاں تک قطعی کا تعلق ہے تو اس تعلق سے نفی یا اثبات واضح ہوجانے کے بعد اس میں غور وفکر کی گنجائش نہیں اور نہ یہ محل اجتہاد ہے، اور یہ واضح امور کی قسموں میں سے ہے؛ اس لئے کہ حقیقتاً اس کا حکم واضح ہے، اور اس کے دائرہ سے باہر جانے والا یقینا خطا کار ہے۔

۳- تعصب کا اختلاف: اس سے مراد وہ اختلاف ہے، جو مسلکی تعصب کا چشمہ لگا کر کیا جائے، جو دراصل جاہلوں کی علامت ہے؛ کیوں کہ یہ اختلاف جھگڑا، انتشار، کینہ اور الزام تراشی و بہتان تک پہنچا تا ہے، باوجود یہ کہ ہمیں معلوم ہے کہ ایسا اختلاف معتبر ہے اور عہد صحابہ سے چلا آ رہا ہے۔

۴- نص شرعی کے خلاف تقلید کی وجہ سے اختلاف: اس سے مراد وہ اختلاف ہے، جو صریح نص شرعی کے موجود ہونے کے باوجود مجتہدین میں سے کسی کی رائے کی اقتدا کی وجہ سے اختلاف کیا جائے۔

(الاعتدال والوسطیة لشرح العقیدة الطحاویة: ۴۷۵-۴۷۷/۲ بیروت ۱۹۷۱)

اختلاف کے اسباب

جتنے بھی اختلافات ہوتے ہیں، ان کے کچھ اسباب ہوتے ہیں، جن کو ہم دو قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں:

۱- اخلاقی اسباب: یہ وہ اسباب ہیں، جن کا تعلق باطن سے ہے، اس کی درج ذیل بنیادیں ہو سکتی ہیں:

(الف) خود پسندی۔

(ب) دوسروں کے ساتھ بدظنی اور بغیر دلیل کے الزام تراشی میں عجلت پسندی۔

(ج) ہوا پرستی۔

(د) شخصی، مسلکی اور جماعتی تعصب۔

(ھ) قومی یا گروہی عصبیت۔

یہ تمام امور اہل قلوب کے نزدیک اخلاق رذیلہ میں داخل ہیں اور جو اختلاف ان رذائل کی وجہ سے پیدا ہو، وہ اختلاف مذموم میں شامل ہے۔ **(الصحوة الإسلامیة بین الاختلاف المشروع للقرضاوی، ص: ۱۲)**

۲- فکری اسباب: اس سے مراد وہ اسباب ہیں، جن کا تعلق نقطۂ نظر کے اختلاف سے ہے، اس کے اسباب درج ذیل ہو سکتے ہیں:

۱- موضوع کی پیچیدگی: قدیم زمانہ سے یہ بات چلی آ رہی ہے کہ فلاسفہ نے اپنے بحث کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا، جس کے اندر بذات خود پیچیدگی اور غموض ہو، جس کے کنہ تک پہنچنا آسان نہ ہو، ظاہر ہے کہ ایسے موضوعات میں ہر شخص کا نظریہ متفق نہیں ہوسکتا ہے اور اسی عدم اتفاق کی وجہ سے اختلاف وجود میں آتا ہے۔

۲- خواہش اور مزاج کا فرق: ہر انسان کا مزاج دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور اسی طرح خواہش اور چاہت بھی اور ہر فرد اپنے مزاج اور اپنی خواہش کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ دوسرے سے اختلاف ہوتا ہے۔

۳- رجحان کا اختلاف: ہر فرد کا رجحان مختلف ہوتا ہے اور وہ اسی رجحان کے ساتھ عمل کو انجام دیتا ہے، اسی رجحان کے مطابق وہ سوچتا ہے اور کسی بھی مسئلہ کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا بھی ہے، اور ظاہر ہے کہ ہر فرد کا رجحان کسی مسئلہ کی بابت یکساں نہیں ہوسکتا، جس کے نتیجہ میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

۴- اسلاف پرستی: اختلاف کا ایک اہم سبب اپنے پیروؤں کی کوری تقلید ہے؛ کیوں کہ اس کے نتیجہ میں عقل کا روزن بند ہوجاتا ہے اور مقلد محض کسی بھی دلیل اور حجت کو تسلیم نہیں کرتا، نتیجہ میں اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔

۵- ادراکی قوتوں کا اختلاف: ہر انسان کے اندر ادراک کی صلاحیت یکساں نہیں ہوتی، کسی کے اندر زیادہ تو کسی کے اندر کم، بعض دفعہ اسی ادراکی قوتوں کے تفاوت کے نتیجہ میں اختلاف رونما ہوتا ہے۔

۶- اقتدار اور بادشاہ کی محبت: تقریباً ہر باشعور فرد کا اپنا ایک نظریہ ہوتا ہے، بالخصوص سیاسی معاملات میں، اور اسی نظریہ کے مطابق وہ اپنی پسند کا حاکم کا منتخب کرتا ہے، اس کے لئے کوشش کرتا ہے اور اپنے آپ کو خطرات میں ڈالتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں ہر ایک کا یا کم از کم ہر قوم کا (خاص طور پر ہندوستانی پس منظر میں) نظریہ مختلف ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں اختلاف واقع ہوتا ہے۔ (**تاریخ المذاهب الإسلامية لأبی زهرة، ص: ۱۰-۷، ط: دار الفکر العربی، قاهره**)

فکری اختلاف کی قسمیں

فکری اختلاف کی درج ذیل شکلیں ہوسکتی ہیں:

(الف) علمی اختلاف۔

(ب) عملی اختلاف۔

علمی اختلاف اور اسباب

اس سے مراد وہ اختلاف ہے، جو کسی دلیل پر غوروفکر کے نتیجہ میں ہو، جیسے: فروعی احکام میں اختلاف،علمی اختلاف کے اسباب عموماً درج ذیل ہوتے ہیں:

۱- نص کے ثبوت اور عدم ثبوت میں اختلاف:علمی اختلاف کا ایک سبب نص کے ثبوت اور عدم ثبوت کے نتیجہ میں ہوتا ہے، ایک فرد کے پاس وہ پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے، جب کہ دوسرے کے پاس نہیں پہنچتی،جس کے پاس پہنچ جاتی ہے، وہ قبول کرتا ہے اور جس کے پاس نہیں پہنچتی، وہ رد کردیتا ہے،جس کے نتیجہ میں اختلاف واقع ہوجاتا ہے، ثبوت اور عدم ثبوت کا یہ اختلاف دراصل رُوات کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے یا متن یا سند میں شذوذ کے پائے جانے کے اختلاف کے سبب پیدا ہوتا ہے۔

۲- فہم نص میں اختلاف:علمی اختلاف کا دوسرا سبب ثابت شدہ نص کی سمجھ کے لحاظ سے ہوتا ہے، جس کی بنیاد مجتہدین کے نزدیک لفظ کے مشترک یا مجمل یا پھر حقیقت یا مجاز ہونے پر ہوتا ہے۔

۳- متعارض نصوص کے مابین جمع وترجیح میں اختلاف: کبھی یہ اختلاف باہم متعارض نصوص کے درمیان جمع وتطبیق یا ترجیح دینے کے نتیجہ میں رونما ہوتا ہے،جس میں بعض دفعہ ایک مجتہد متعارض نصوص کے درمیان تعارض کو نہیں مانتا، ایسی صورت میں ترجیح کا عمل اپناتا ہے، جب کہ کبھی دو متعارض نصوص کو دو حالوں میں محمول کرتا ہے۔

۴- اصولی قواعد اور مصادر استنباط میں اختلاف: بسا اوقات یہ اختلاف ان اصولی قواعد اور مصادر استنباط کے سبب پیدا ہوتا ہے، جو مجتہدین نے وضع کرر کھے ہیں؛ کیوں کہ ہر مجتہد کے نزدیک حدیث کے قبول کرنے اور نہ کرنے کے شرائط وقواعد دوسرے مجتہد کی شرطوں اور قواعد سے مختلف ہوتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں اختلاف کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔(**دراسات فی الاختلافات العلمیة لمحمد ابوالفتح البیانونی، ص: ۳۱ ومابعدھا، ط: دارالسلام، قاھرہ**)

عملی اور فقہی فروعاتی اختلاف

اس سے سے مراد وہ اختلاف ہے، جو عمل کے دائرہ میں مصالح اور مفاسد کے درمیان موازنہ کے نتیجہ میں ہو، جیسے: قیام پاکستان کا اختلاف یا غیر اسلامی جمہوری ممالک میں اقتدار میں شرکت کا اختلاف۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے مکلف بندوں کو جو بھی احکام دئے ہیں، وہ دوطرح کے ہیں، ایک وہ ہیں، جن میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہیں، انھیں ''اصول'' کہا جاتا ہے، جیسے: وجود باری، اس کی وحدانیت، فرشتے، کتب سماویہ، رسالت محمدیہ، موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا، پنج وقتہ نمازیں، شراب اور زنا کی حرمت وغیرہ، یہ وہ مسائل ہیں، جن میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔

دوسرے وہ احکام ہیں، جن میں دلائل کی پوشیدگی، یا ان کے اجمال، یا ایک سے زائد معانی پر لفظ کی دلالت، یا مجتہد تک پہنچنے کے اعتبار سے روایت حدیث کی قوت وکمزوری، یا ان کے آپسی تعارض، یا پھر ان کے ثبوت میں اختلاف، یا مجتہدین کے مابین مصدر تشریعی پر اعتماد میں تفاوت، یا مصالح وضروریات کی رعایت کی وجہ سے اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے، ان کو ''اجتہادی مسائل'' اور ''فروعات فقہیہ'' کہا جاتا ہے (**الموسوعة الفقیه الکویتیه، لفظ: اختلاف: ۲۹۲/۱ ومابعدها، التقریر والتحبیر: ۳۰۳/۳**)۔

فروعی اور اجتہادی اختلاف درحقیقت اختلاف نہیں؛ بل کہ رحمت، وسعت، گنجائش اور قابل فخر قانون اسلامی کا خزانہ ہے، اس اختلاف کے بارے میں قاسم بن محمدؒ کہا کرتے تھے:

کان اختلاف أصحاب رسول اللہ رحمة للناس۔ (**الطبقات الکبری: ۸۹/۵**)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا اختلاف لوگوں کے لئے رحمت ہے۔

اور اسی اختلاف کے بارے میں امام مالکؒ نے ہارون رشید سے اس وقت کہا، جب انھوں نے ان کی کتاب ''مؤطا'' کو تمام لوگوں کے لئے لازم کرنے کو کہا:

> یاأمیر المؤمنین! إن اختلاف العلماء رحمة من الله تعالیٰ علی هذه الأمة، کل یتبع مایصح عنده، وکلهم علی هدی، وکل یرید الله تعالیٰ۔ (کشف الخفاء ومزیل الإلباس عمااشتهر من الأحادیث علی ألسنة الناس لإسمعیل بن محمد العجلونی: ۸۰/۱)
>
> اے امیر المؤمنین! علماء کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت پر رحمت ہے، ہر شخص اس کی پیروی کرتا ہے، جو اس کے نزدیک صحیح ہو، اور تمام لوگ ہدایت پر ہیں، اور ہر شخص اللہ ہی کا ارادہ کرتا ہے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں:

اعلم أن اختلاف المذاهب فی هذه الملة نعمة کبیرة وفضیلة عظیمة، وله

سر لطيف، أدركه العالمون، وعمى عنه الجاهلون، حتى سمعت بعض الجهال يقول: النبيﷺ جاء بشرع واحد، فمن أين مذاهب أربعة؟ ومن العجب أيضاً من يأخذ في تفصيل بعض المذاهب تفصيلاً يؤدي إلى تنقيص المفضل عليه، وسقوطه، وربما أدى إلى خصام بين السفهاء وصارت عصبية وحمية الجاهلية، والعلماء منزهون عن ذلک، وقد وقع الخلاف في الفروع بين الصحابة رضي الله عنهم، وهم خير الأمة، فما خاصم أحد منهم أحداً، ولا عادى أحد أحداً، ولا نسب أحد أحداً إلى خطأ وقصور۔ **(جزيل المواهب في اختلاف المذاهب، ص: ۲۵، ط: دار الاعتصام)**

جاننا چاہئے کہ اس شریعت میں مذاہب کا اختلاف ایک بڑی نعمت اور عظیم فضیلت ہے، اوراس میں ایک لطیف راز ہے، جاننے والے (علماء) جس کو پالیتے ہیں اور جاہل سے یہ پوشیدہ رہتا ہے؛ یہاں تک کہ بعض جاہلوں کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ: نبی کریم ﷺ ایک شریعت لے کر آئے تھے تو یہ مذاہب اربعہ کہاں سے آگئے؟ اوراس پر بھی تعجب ہے کہ کچھ لوگ بعض مذاہب کی ایسی تفصیل کرنے لگتے ہیں، جس سے مفضل علیہ کی تنقیص اورتوہین ہوتی ہے، اور بسااوقات یہ ناسمجھوں کے مابین جھگڑا پیدا کردیتا ہے اور یہ جاہلی عصبیت وحمیت بن جاتی ہے، اورعلماء اس سے بری رہتے ہیں، اوربعض دفعہ صحابہ کے درمیان فروع میں اختلاف ہواہے اوراس امت کے بہترین افراد ہیں؛ چنانچہ ان میں سے کسی نے کسی سے جھگڑا کیا، نہ دشمنی کی اور نا ہی کسی کی طرف خطا اورقصور کی نسبت کی۔

اختلاف کی اس رحمت کا فائدہ کسی زمانہ سے زیادہ آج کے ترقی یافتہ دور میں ہوا، جتنے بھی فقہی ابواب ہیں اور ہمارے فقہی ذخیرۂ کتب میں جو مسائل مذکور ہیں، اگر آج کسی ایک مذہب پر کوئی شخص عمل کرنا چاہے تو قدم قدم پر اسے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا، یہی وجہ ہے کہ تمام مسالک نے جمود وتعطل کے راستہ کو ترک کرکے اس اختلاف سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس کی اوراپنے علمی سیمیناروں اورورک شاپس میں ایک مسلک سے عدول کرکے دوسرے مسلک کو اختیار کیا اورامت کو دشواری سے بچا کر ایک وسیع اورآسان دین فراہم کیا، اگر یہ اجتہادی اختلافات نہ ہوتے تو آج دین پر عمل پیرا رہنا کس قدر دشوار ہوتا، وہ کسی بھی صاحب بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔

لیکن اس کے ساتھ یہ شکوہ بھی بے جا نہیں کہ بعض لوگ اس اختلاف کو وسعت وگنجائش کے بجائے نزاع باہمی کا ذریعہ بنا کر امت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اپنے سوا تمام مسالک کو نادرست قرار دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سو فیصد غلط ہے؛ کیوں کہ اجتہادی مسائل میں تو عہد صحابہ سے اوپر اٹھ کر عہد رسالت میں بھی اس کی کئی مثالیں ہمیں مل جاتی ہیں، لہٰذا ہر مجتہد کی رائے کا احترام کرنے کا اپنے کو خوگر بنانا چاہئے اور اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کو (إذا حكم الحاكم، فاجتهد، ثم أصاب فله أجران، و إذا حكم، فاجتهد، ثم أخطأ فله اجر (**بخاری، باب أجر الحاكم إذا اجتهد**، حدیث نمبر: ۶۸۰۵، **مسلم**، حدیث نمبر: ۳۲۴۰) اپنے پیش نظر رکھتے ہوئے خطا وصواب کے احتمال پر اعتماد کر کے صرف اپنے کو ہی درست قرار دینے کے بجائے دوسرے کے حق پر ہونے کا بھی یقین رکھنا چاہئے۔

اختلاف کی شرائط

یہ بات گزر چکی ہے کہ اختلاف محمود کی گنجائش ہے اور فقہی فروعات کا اختلاف ''اختلاف محمود'' میں سے ہے، اس کی وجہ سے تشریعی احکام پر عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس اختلاف کے لئے کچھ شرطیں بھی ہیں؟ اس سلسلہ میں دو بنیادی شرطیں ہیں، ایک کا تعلق محل اختلاف سے ہے، جب کہ دوسرے کا تعلق اختلاف کرنے والے سے ہے۔

محل اختلاف کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ مجتہد فیہ ہو، منصوص نہ ہو؛ کیوں کہ منصوص میں اجتہاد کی گنجائش نہیں اور جہاں اجتہاد کی گنجائش نہیں، وہاں اختلاف کی بھی گنجائش نہیں، امام شافعیؒ اختلاف حرام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> **كل ما أقام الله به الحجة في كتابه، أو على لسان نبيه، منصوصاً بيناً، لم يحل الاختلاف فيه لمن علمه۔ (الرسالة: ۵۶۰/۱)**
>
> ہر وہ شئ، جس کے تعلق سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں، یا اپنے نبی کی زبان سے حجت قائم کردی ہو، وہ واضح منصوص ہے، واقف کار کے لئے اس میں اختلاف جائز نہیں۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ مجتہد فیہ وہ حکم ہے، جس کی بابت کوئی دلیل قطعی نہ ہو، امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

> **كل حكم شرعي، ليس فيه دليل قطعي، وإنما نعني بالمجتهد فيه،**

مالایکون المخطئ فیه أثماً۔ (**المستصفی: ۲/۳۵۴**)

ہر حکم شرعی، جس کے تعلق سے دلیل قطعی نہ ہو (وہ مجتہد فیہ ہے، اور مجتہد سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس میں خطا کرنے والا گناہ گار نہیں ہوتا۔ (**المستصفی: ۲/۳۵۴**)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

إذاحکم الحاکم، فاجتهد، ثم أصاب فله أجران، وإذاحکم، فاجتهد، ثم أخطأ فله اجر۔(بخاری، باب أجرالحاکم إذااجتهد، حدیث نمبر: ۶۸۰۵، **مسلم،** حدیث نمبر: ۳۲۴۰)

جب حاکم فیصلہ کا ارادہ کرتا ہے، پس وہ اجتہاد کرتا ہے، پھر درست اجتہاد کرتا ہے تو اس کے لئے دو اجر ہیں، اور جب فیصلہ کا ارادہ کرتا ہے اور اجتھاد کرتا ہے، پھر غلطی کر بیٹھتا ہے تو اس کے لئے ایک اجر ہے۔

جہاں تک اختلاف کرنے والے کا تعلق ہے تو اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ اس کی اہلیت رکھتا ہو، اہلیت سے مراد ایک تو علمی اہلیت ہے، یعنی وہ قرآن وحدیث کے عام اجمالی مسائل، نیز اجماعی مسائل سے واقف ہو اور قرآن وحدیث کے علاوہ دیگر ادلہ پر اچھی نظر ہونے کے ساتھ ساتھ علوم حدیث وجرح وتعدیل پر اچھا تجربہ رکھتا ہو۔

دوسرے صلاح ودیانت کی اہلیت ہے، یعنی اس کے اندر ورع وتقوی پایا جاتا ہو؛ تاکہ کوئی بھی بات کہنے سے پہلے سو بار سوچے اور غلط بات زبان پر نہ آئے، نیز جب بھی کچھ کہے تو پوری دیانت داری کے ساتھ کہے، اس میں کسی مفاد کو سامنے رکھ کر خیانت سے کام نہ لے۔ (**أدب الاختلاف فی مسائل العلم والدین، لمحمد عوامة، ص: ۴۹ ومابعدها**)

خروج من الاختلاف کی کوشش

گزشتہ صفحات سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ اختلاف ایک ناگزیر امر ہے، تاہم اختلاف سے بچ کر نکلنے کی کوشش ہونی چاہئے اور یہ کوشش ایسی ہونی چاہئے، جس میں تمام اختلاف کرنے والوں کی تھوڑی بہت رعایت ہوجائے، اسی رعایت کا نام ''خروج من الاختلاف'' ہے، ہماری فقہ کی کتابوں میں جابجا اس کی مثالیں ملتی ہیں؛ چنانچہ مسئلۂ بناء کے تعلق سے فقہ حنفی میں لکھا ہے:

والأفضل الاستئناف خروجاً من الخلاف وعملاً بالإجماع۔

(**حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح، باب مایفسد الصلاة، ص: ۳۳۳**)

اجماع پر عمل کرتے اور اختلاف سے بچتے ہوئے استیناف افضل ہے۔

قراءت کی ادائیگی میں مالکیہ کا مسلک یہ ہے کہ دل کے بجائے زبان سے جاری ہونا چاہئے، اگرچہ کہ خود بھی نہ سن سکے؛ لیکن زبان سے جاری کرنا قراءت کی ادائے گی کے لئے کافی ہے؛ تاہم اس مسئلہ میں دیگر علماء کا اختلاف ہے؛ اس لئے ان کی رعایت کرتے ہوئے اسماع نفس کو اولیٰ قرار دیا گیا ہے، علامہ علیش مالکیؒ فرماتے ہیں:

والأولیٰ إسماع نفسه خروجاً من الخلاف۔(**منح الجلیل شرح مختصر الخلیل، فصل فی فرائض الصلاة...: ۱/۲۲۲، ط: دارالفکر بیروت**)

اختلاف سے بچتے ہوئے اسماع نفس اولیٰ ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک انسان کی منی پاک ہے، اگر بدن یا کپڑے میں لگ جائے تو اسے دھوئے بغیر بھی نماز اداء کی جاسکتی ہے؛ لیکن چوں کہ اس مسئلہ میں دیگر ائمہ کا اختلاف ہے؛ اس لئے اس سے بچتے ہوئے اس کے دھونے کو مستحب قرار دیا گیا ہے؛ چنانچہ علامہ غمراوی فرماتے ہیں:

ویستحب غسل المنی خروجاً من الخلاف۔(**السراج الوهاج، باب النجاسة، ص: ۲۴**)

اختلاف سے بچتے ہوئے منی کو دھونا مستحب ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں جمعہ کی نماز زوال سے پہلے بھی پڑھ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک نماز عید کا وقت ہی جمعہ کی نماز کا وقت ہے؛ لیکن دیگر ائمہ کے یہاں اس کا وقت زوال کے بعد شروع ہوتا ہے، اس اختلاف سے بچتے ہوئے امام احمدؒ کے یہاں بھی زوال کے بعد ہی افضل ہے؛ چنانچہ مشہور حنبلی فقیہ منصور بن یونس بہوتیؒ لکھتے ہیں:

(أحدها)أی: شروط الجمعة (الوقت، وهومن أول وقت العيد، و) فعلها (بعده)أی: بعد الزوال(أفضل) خروجاً من الخلاف۔ (**شرح منتهى الإرادات، فصل شروط الجمعة: ۱/۳۱۲**)

جمعہ کی ایک شرطوں میں سے ایک وقت کا ہونا ہے اور وہ عید کے اول وقت سے ہے؛ لیکن اختلاف سے بچتے ہوئے زوال کے بعد اس کی ادائیگی کرنا افضل ہے۔

خروج من الاختلاف کی مثالیں نہ صرف یہ کہ ہماری کتابوں میں ملتی ہیں؛ بل کہ علماء نے اس کی

ترغیب بھی دی ہے؛ چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

إن العلماء متفقون على الحث على الخروج من الخلاف إذالم يلزم منه إخلال بسنة، أووقوع خلاف آخر۔ (شرح النووى على مسلم: ۲/۲۳)

علماء خروج من الخلاف کی ترغیب دینے میں متفق ہیں، جب کہ اس کی وجہ سے کسی سنت میں خلل لازم نہ آتا ہو اور نا ہی دوسرا اختلاف واقع ہوتا ہو۔

اور ابھارنے پر ہی اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ اسے مستحب بھی قرار دیا ہے؛ چنانچہ **''الموسوعة الفقهية''** میں ہے:

ذهب جمهور العلماء إلى استحباب مراعاة الخلاف فى الجملةباجتناب ما اختلف فى تحريمه، وفعل مااختلف فى وجوبه۔ (الموسوعة الفقهية:لفظ: اختلاف: ۲۹۲/۱ ومابعدها)

جمہور علماء اختلاف کی رعایت کے مستحب ہونے کے قائل ہیں، بہ ایں طور کہ حرمت کے اختلاف میں اجتناب اور وجوب کے اختلاف میں عمل کو اختیار کیا جائے۔

اب سوال یہ کہ اس کی رعایت کس طرح کی جائے گی؟ تو اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱- اگر اختلاف حرام وحلال میں ہو تو خروج من الاختلاف کا افضل طریقہ اجتناب ہے، اس سلسلہ میں قاعدہ بھی ہے کہ: **إذا اجتمع الحلال والحرام، غلب الحرام۔** (جب حلال وحرام کا اجتماع ہوجائے تو حرام غالب ہوگا)، اس قاعدہ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:

إذاتعارض دليلان: أحدهمايقتضى التحريم، والآخر الإباحة، قدم التحريم۔

جب دو دلیلوں کا تعارض ہوجائے، ایک حرمت کا تقاضا کرے اور دوسرا اباحت کا تو حرمت کو مقدم کیا جائے گا۔

پھر اس کی علت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

وعلله الأصوليون بتقليل النسخ؛ لأنه لوقدم المبيح للزم تكرارالنسخ؛لأن الأصل فى الأشياء الا إباحة، فإذاجعل المبيح متأخراً،كان المحرم ناسخاً للإباحة الأصلية، ثم يصيرمنسوخاً بالمبيح، ولوجعل المحرم متأخراً، لكان ناسخاً للمبيح، وہولم ينسخ شيئاً؛ لكونه على وفق الأصل۔(الأشباه والنظائر، ص:۱۲۱)

اصولیین نے اس کی علت تقلیل نسخ کو بتایا ہے؛ اس لئے کہ مبیح کومقدم کرنے کی صورت میں تکرار نسخ لازم آئے گا؛ کیوں کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے، پس جب مبیح کومؤخر کیا جائے گا تومحرم اباحت اصلیہ کے لئے ناسخ ہوگا، پھر یہ مبیح کے ذریعہ سے منسوخ ہوگا؛ لیکن اگرمحرم کومؤخر کیا جائے تو وہ مبیح کے لئے ناسخ ہوگا اوراصل کے مطابق ہونے کی وجہ سے وہ کسی کو نسخ نہیں کرے گا۔

۲- اگراختلاف واجب اور مستحب ہونے میں ہےتوخروج من الاختلاف کا افضل طریقہ ''واجب پرعمل'' کرنا ہے،عزبن عبدالسلامؒ فرماتے ہیں:

وإن دارالفعل بين الوجوب والندب، بنينا على أنه واجب، وأتينابه... وإن داربين الندب والإباحة، بنيناعلى أنه مندوب وأتينابه۔(قواعد الأحكام لعزبن عبدالسلام: ۱/۱۴)

اگرفعل واجب اورمندوب کے درمیان دائر ہوتو ہم واجب مان کراس پرعمل کریں گے......
اوراگر مندوب اورمباح کے درمیان دائر ہوتو ہم مندوب مان کراس پرعمل کریں گے۔

مقارنہ کا طریقہ

جب مقارنہ مقصود ہوتو درج ذیل امور کو سامنے رکھ کر مقارنہ کیا جائے:

۱- تصویر مسئلہ: حکم بیان کئے بغیر مسئلہ کی مکمل طور پر وضاحت کی جائے؛ تا کہ مقارنہ اوردراسہ میں آسانی ہو۔

۲- توضیح مسئلہ: اس کی دوصورتیں ہیں:

(الف) مسئلہ متفق علیہ ہو: ایسی صورت میں مسئلہ کواس کے حکم اوردلائل کے ساتھ بیان کیا جائے اورمعتبر حوالوں کے ذریعہ اس کے متفق علیہ ہونے کی نشاندہی بھی کی جائے۔

(ب) مسئلہ مختلف فیہ ہو: ایسی صورت میں درج ذیل امور کو واضح کیا جائے:

۱) محل خلاف: یہ اس وقت ذکر کیا جائے گا، جب مسئلہ کی بعض صورت محل اختلاف ہواوربعض صورت محل اتفاق،اگرصرف محل اختلاف ہوتومحل اختلاف کے بجائے صرف مسئلہ کا ذکر کافی ہوگا۔

۲) اقوال ائمہ:اس مسئلہ کے تعلق سے اہل علم کے اختلافی اقوال ان کے نام کے ساتھ ذکر کیا جائے اوران کے فقہی رجحانات کوبھی بیان کیا جائے۔

۳) معتبر فقیہ اور فقہی مذاہب پر اکتفاء: اقوال نقل کرنے میں معتبر فقہائے کرام اور معتبر فقہی مذاہب کو بیان کرنے پر اکتفاء کیا جائے۔

۴) مفتی بہ قول کا ذکر: اقوال نقل کرنے میں ضعیف قول کو نقل نہ کیا جائے؛ بل کہ امام اور مذہب کے مفتی بہ قول کو ذکر کیا جائے۔

۵) دلائل کا احاطہ: ہر قول کو نقل کرنے کے بعد ان کی تمام مستدلات کو ذکر کیا جائے؛ تا کہ اگلے مرحلہ میں آسانی ہو۔

۶) قوی ترین دلائل کا ذکر: دلیل ذکر کرنے میں مذہب کے قوی ترین دلیل کو پیش کیا جائے، کمزور دلیل کو ذکر نہ کیا جائے۔

۷) مناقشہ: صحت وقوت، معمول بہا اور غیر معمول بہا اور عمل کے لحاظ سے یسر وآسانی کو سامنے رکھتے ہوئے دلائل کو جانچا اور پرکھا جائے۔

۸) عمل ترجیح: پھر اس کے بعد ائمہ کے اقوال میں سے کسی ایک قول کو راجح قرار دیا جائے۔

فقہ مقان پر تالیف شدہ بعض اہم کتابیں

ہمارے فقہاء میں سے بہت ساروں نے مذاہب کے درمیان مقارنہ کے ساتھ کتابیں تالیف کی ہیں، یہاں ان میں سے چند کو ذکر کیا جاتا ہے:

۱- اختلاف الفقہاء لابن جریرالطبری(م:۳۱۰ھ)

۲- اختلاف الفقہاء لأبی جعفرالطحاوی(م:۳۲۱ھ)

۳- الأوسط فی السنن والإجماع والاختلاف لابن المنذر(م:۳۱۸ھ)

۴- تأسیس النظر للدبوسی الحنفی(م:۴۳۰ھ)

۵- اختلاف العلماء للإمام محمدبن نصرالمروزی(م:۲۹۴ھ)

۶- التجریدللقدوری الحنفی(م:۴۲۸ھ)

۷- الخلافیات للبیہقی الشافعی(م:۴۵۸ھ)

۸- الوسائل فی فروق المسائل لابن جماعة الشافعی(م:۴۸۰ھ)

۹- مختصرالکفایة للعبدری الشافعی(م:۴۹۳ھ)

۱۰- حلیة العلماء فی اختلاف الفقہاء لأبی بکر محمدالشاشی (م:۵۰۷ھ)

۱۱- الإشراف على مذاہب الأشراف للوزیرابن ہبیرۃ الحنبلی(م:۵۶۰ھ)

۱۲- اختلاف الفقہاء لمحمدبن محمدالباہلی الشافعی(م:۳۲۱ھ)

۱۳- بدائع الصنائع للکاسانی الحنفی(م:۵۸۷ھ)

۱۴- بدایۃ المجتہد لابن رشد المالکی(م:۵۹۵ھ)

۱۵- الحاوی الکبیر للماوردی الشافعی(م:۴۵۰ھ)

۱۶- المغنی لابن قدامۃ المقدسی الحنبلی(م:۶۲۰ھ)

۱۷- المحلی لابن حزم الظاہری (م:۴۵۶ھ)

۱۸- البحرالزخارالجامع لمذاہب علماء الأمصار لأحمد المرتضی(م:۸۴۰ھ)

۱۹- مختصراختلاف العلماء للرازی(م:۳۷۰ھ)

۲۰- القوانین الفقہیۃ لابن جزی(م:۷۴۱ھ)

۲۱- المعونۃ فی الجدل لأبی اسحق ابراہیم بن علی الشیرازی(م:۴۷۶ھ)

۲۲- طریقۃ الاختلاف فی الفقہ بین الأئمۃ الأسلاف لمحمدبن عبدالحمید الأسمندی الحنفی(م:۵۵۲ھ)

۲۳- الإفصاح عن معانی الصحاح للوزیرابن ہبیرۃ الحنبلی(۵۶۰ھ)

۲۴- المجموع لمحی الدین بن شرف النووی(م:۶۷۶ھ)

۲۵- رحمۃ الأمۃ فی اختلاف الأئمۃ لمحمدبن عبدالرحمن الدمشقی (م:۷۸۰ھ)

۲۶- موجودہ زمانہ میں جس کتاب کوکافی شہرت حاصل ہوئی، وہ مرحوم ڈاکٹر وہبہ زحیلی (م: ۱۴۳۶ھ/ ۲۰۱۵ء) کی ''**الفقہ الإسلامی وأدلتہ**'' ہے، نیز آج کل جتنی بھی کتابیں لکھی جارہی ہیں، خصوصاً عالم عرب میں، وہ سب فقہ مقارن کی ترتیب پر ہی ہوتی ہیں، اسی طرح خصوصیت کے ساتھ ''الفقہ المقارن'' کے نام سے بھی کافی کتابیں وجود میں آئی ہیں، جن میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱- مقارنۃ المذاهب فی الفقہ للشیخ محمودشلتوت(م: ۱۳۸۳ھ) والشیخ محمدعلی السایس(م: ۱۳۹۶ھ)

۲- بحوث فی الفقہ الإسلامی وأصولہ للأستاذ الدکتور محمدفتحی الدرینی(م: ۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء)

۳- محاضرات فی الفقه المقارن للدكتور محمدسعيدرمضان البوطی(م: ۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء)

۴- الفقه المقارن للأستاذ محمدرأفت ورفاقه۔

۵- بحوث فی الفقه المقارن للأستاذ محمود أبوليل والأستاذ ماجدأبورخية۔

۶- منهاج الطالب فی المقارنة بين المذاهب للدكتور عبدالسميع أحمدإمام (م:۱۴۰۹ھ)۔

۷- الفقه المقارن لحسن أحمدالخطيب(۱۴۴۱ء/۲۰۱۹ھ)

ان کتب کے علاوہ ''فقہ الخلاف'' پرلکھی گئی کتابیں بھی فقہ مقارن میں شمار کی جاتی ہیں؛لیکن چوں کہ ''اختلاف'' کا دائرہ بہت وسیع ہے؛ اس لئے بہت ساری کتابوں میں اختلاف کے تمام پہلوؤں کوشامل کیا گیا ہے، خاص فقہ کے موضوع پرنہیں؛ اس لئے ان سے استفادہ کے وقت اس پرتوجہ رکھنے کی ضرورت ہے۔فقہ مقارن اورعلم الخلاف کا یہ ایک مختصر تعارف تھا، امید کہ قاری کے لئے نفع بخش ہوگا، اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ہم کنار کرے،آمین!

● ● ●

کوفہ: سرزمین حدیث

مولانا محمد فرقان پالن پوری
(رفیق شعبہ تحقیق المعہد العالی الاسلامی)

کوفہ موجودہ دور میں عراق کا ایک شہر ہے، جو دریائے فرات کے کنارے ہے، موجودہ دور میں یہ صوبہ نجف میں شامل ہے، نجف سے صرف دس کلو میٹر دور اور بغداد سے جنوب میں ایک سوستر کلو میٹر دور ہے، اور یہی کوفہ حضرت علیؓ کے دور میں اسلامی مملکت کا دارالخلافہ تھا۔

دور فاروقی میں جب سعد بن ابی وقاصؓ نے مدائن کے علاقے کو فتح کرلیا تو کئی صحابہ کرامؓ اور دیگر عرب نے وہاں بود و باش اختیار کرلی؛ مگر مدائن کی آب وہوا صحابہ کرامؓ کو راس نہ آئی، مدائن میں گردوغبار کی کثرت کی وجہ سے ان کے رنگ سیاہ ہونے لگے اور جسمانی طور پر وہ کمزور ہونے لگے، اس صورت حال کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو، جو اس وقت مدائن میں ہی مقیم تھے، ایک خط لکھا کہ ان صحابہ کرامؓ کے لئے ایک نیا شہر آباد کیا جائے، جو ان حضرات کے رہن سہن کے لئے مناسب ہو اور ان کی طبیعت کے موافق ہو، خط ملتے ہی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت حذیفہؓ اور حضرت سلیمان بن زیادؓ کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ اس نئے شہر کے لئے مناسب جگہ کا انتخاب کریں؛ چنانچہ ان دونوں حضرات نے مقام کوفہ کو پسند کیا اور اس کے متعلق ساری تفصیلات لکھ کر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی خدمت میں روانہ کردی، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی طرف سے اس کی منظوری مل جانے کے بعد محرم الحرام سن ۱۷ھ میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔

سب سے پہلے وسط شہر میں ایک مسجد تعمیر کی گئی اور اس کے ارد گرد کچے مکانات بنائے گئے؛ مگر اثنائے سال یہ مکانات آگ کی تباہ کاریوں کا شکار ہو گئے، اس واقعے کے بعد حضرت عمرؓ نے پختہ مکانات تعمیر کرنے کا حکم دیا؛ نیز پختہ سڑکیں، چوڑی گلیاں اور ایک خوبصورت بازار بھی بنایا گیا، جس کے قریب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے قصرِ حکومت تعمیر کروایا؛ غرض یہ کہ کوفہ تمام سہولتوں سے مزین ایک خوبصورت شہر بن گیا، پھر

پورے عرب سے فصحاء اور اہل علم کو یہاں لا کر بسایا گیا مختصر عرصہ میں کوفہ ایک عرب خطے میں تبدیل ہوگیا اور اس کا شمار عالم اسلام کے عظیم الشان شہروں میں ہونے لگا۔

سرزمین کوفہ میں مسلمانوں کی کثرت اور علم وعمل میں ان کی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے، جو امام سمعانیؒ نے بہ سند متصل حافظ کبیر امام ابن عقدہؒ سے نقل کی ہے:

أدركت بالكوفة أربعة آلاف مسجد، في كل مسجد مؤذن ومقرء (المنتخب من معجم شيوخ السمعاني، حرف الحاء، ص: ٦٠١)

میں نے کوفہ میں چار ہزار مساجد دیکھی ہے، ہر مسجد میں مؤذن اور قاری مقرر تھے۔

حافظ ابن ناصر الدین دمشقیؒ نے تصریح کی ہے کہ:

وكان عمر رضي الله عنه قد أعد في كل مصر خيلا كثيرة للجهاد، فكان بالكوفة أربعة آلاف فرس معدة لعدو يدهمهم (توضيح المشتبه في ضبط أسماء الرواة، حرف الجيم: ٢/٢٠٨)

حضرت عمرؓ نے ہر شہر میں جہاد کے لئے کثرت سے گھوڑے تیار کر رکھے تھے؛ چنانچہ صرف کوفہ میں ہر وقت چار ہزار گھوڑے دشمن کو خوف زدہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

کوفہ میں صحابہ کرامؓ کا ورود مسعود

عہد فاروقی میں یعنی حضرت عمرؓ کے دور میں جب عراق فتح کرلیا گیا تو آپ کے حکم سے سنہ ۱۷ھ میں کوفہ آباد ہوا، اور وہاں اسلامی لشکر کے رہنے اور ان کی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کیا گیا، کہا جاسکتا ہے کہ یہ ابتدا میں لشکر اسلام کی چھاؤنی تھی، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ کرام کے مسکن اور مدفن ہونے کا شرف اس شہر کو حاصل ہے، مشہور محدث علامہ عجلی کی تحقیقات کے مطابق صرف کوفہ میں آباد ہونے والے صحابہؓ کرام کی تعداد پندرہ سو ہے، جب کہ عراق کے دوسرے شہروں میں آباد ہونے والے صحابہؓ کرام کی تعداد اس کے علاوہ ہے، حضرت عمرؓ نے جن صحابہ کرامؓ کو بطور خاص کوفہ بھیجا تھا اس میں نمایاں طور پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں، آپ ابن ام عبد کی عرفیت سے مشہور ہیں، حضرت عمرؓ نے آپ کو اہل کوفہ کو قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم دینے کیلئے بھیجا تھا، اور ساتھ میں حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ کو حضرت ابن مسعودؓ کی علمی اہمیت یہ کہہ کر بتائی:

إني قد بعثت إليكم عمار بن ياسر أميرا وعبد الله بن مسعود معلما ووزيرا، وهما

من النجباء من أصحاب محمد صلى الله عليه وآله وسلم من أهل بدر، فاقتدوا بهما واسمعوا، وقد آثرتكم بعبد الله بن مسعود على نفسي (تذكرة الحفاظ للذهبي: ۱/۱٦)

''میں تمہارے پاس عمار بن یاسرؓ کو بطور امیر اور عبداللہ ابن مسعودؓ کو بطور مدرس اور وزیر بنا کر بھیج رہا ہوں، یہ دونوں حضرات آپ ﷺ کے معززترین بدری صحابہ میں سے ہیں، آپ لوگ ان دونوں کی اتباع کرنا اور ان کی بات ماننا، میں نے آپ کے ہاں ابن مسعودؓ کو بھیج کر اپنے او پر تمہیں ترجیح دی ہے''۔

حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے اس بات کا بخوبی اظہار ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کو علم میں غیر معمولی دسترس حاصل تھی، حتیٰ کہ خلیفہ دوم بھی ان کے علم سے بے نیاز نہیں تھے، نیز ابن مسعود کی اہمیت کا اندازہ آپ ﷺ کے فرمان سے بھی لگایا جا سکتا ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من سره أن يقرأ القرآن غضا كما أنزل، فليقرأه بقراءة ابن أم عبد(مسند الإمام أحمد بن حنبل، مسند عبد الله بن مسعود رضي الله تعالى عنه، رقم الحديث: ۴۳۴۰)

جو قرآن کو تر و تازہ اور بالکل اسی طرح پڑھنا چاہے جیسا کہ وہ نازل ہوا ہے تو وہ ابن ام عبد کی طرح قرآن پاک پڑھے۔

ایک دوسرے موقع سے آپ ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا:

رضيت لأمتي ما رضي لها ابن أم عبد (المستدرك على الصحيحين، ذكر مناقب عبد الله بن مسعود رضي الله عنه، رقم الحديث: ۵۳۸۸)

میں نے اپنی امت کیلئے اس چیز کو پسند کیا، جس کو ابن ام عبد نے پسند کیا۔

حضرت عمرؓ کا تاثر حضرت عبداللہ بن مسعود کے متعلق او پر گزر چکا ہے؛ لیکن ایک دوسرے موقع سے حضرت عمرؓ نے آپ کے متعلق فرمایا:

أنت كنيف مملوء علماً (التاريخ الكبير لابن أبي خيثمة: ۲/۹۵۱)

علم وفضل سے بھرے برتن کا نام ابن مسعود ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے حضرت عمرؓ کی ان تمام توقعات کو پورا کر دکھایا؛ چنانچہ آپؓ کوفہ کی تعمیر سے لے کر حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت کے اخیر تک یہیں مقیم رہ کر اہل کوفہ کو قرآن وسنت اور فقہ کی تعلیم دینے میں مصروف رہے اور اپنے ساتھیوں؛ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عمار بن یاسر، حضرت ابوموسی اشعریؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی معیت میں شب وروز کی تگ ودو کے بعد مختصر عرصے میں کوفہ کو فقہاء ومحدثین سے بھر دیا، علامہ خطیب بغدادیؒ آپ کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

وبعثه إلى أهل الكوفة ليقرئهم القرآن، ويعلمهم الشرائع والأحكام، فبث عبدالله فيهم علماً كثيراً، وفقه منهم جما غفيرا (تاريخ بغداد، ذكر خبر المدائن على الاختصار، عبدالله بن مسعود: ۱/۴۸۲)

حضرت عمرؓ نے قرآن وسنت اور شریعت واحکام کی تعلیم دینے کی غرض سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو کوفہ بھیجا؛ چنانچہ انہوں نے وہاں خوب علم پھیلایا اور ایک بڑی تعداد کو فقیہ بنادیا۔

محدث کبیر علامہ زاہد الکوثریؒ لکھتے ہیں:

فإبن مسعود هذا عنى بتفقيه أهل الكوفة، وتعليمهم القرآن من سنة بناء الكوفة إلى أواخر عثمان رضى الله عنه، عناية لا مزيد عليها، إلى أن أمتلئت الكوفة بالقراء، والفقهاء والمحدثين، بحيث أبلغ بعض جهات أهل العلم عدد من تفقه عليه، وعلى أصحابه، نحو أربعة آلاف عالم.

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بناءِ کوفہ سے لے کر حضرت عثمان غنیؓ کے اخیر دور تک اہل کوفہ کو فقیہ بنانے اور انہیں قرآن وسنت کی تعلیم دینے میں ہمہ تن مصروف ومشغول رہے، یہاں تک کہ سرزمین کوفہ کو قراء اور فقہاء ومحدثین سے بھر دیا، بقول بعض ثقہ علماء ''کوفہ میں جن لوگوں نے آپ سے اور آپ کے ساتھیوں سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، ان کی تعداد چار ہزار رہے''۔(فقہ اہل العراق، حدیثہم، ص: ۵۲)

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اپنی وفات سے کچھ دن پہلے مدینہ منورہ دوبارہ تشریف لے گئے اور مدینہ منورہ میں ہی سنہ ۱۳۲ھ میں انتقال فرمایا اور اسی مقدس وبابرکت سرزمین میں مدفون ہوئے؛ غرض کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علم وفضل اور آپ کی فقہی مہارت کا اکابر صحابہ اور بعد کے تمام فقہاء نے اعتراف کیا

ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت عمرؓ کی خلافت کے عہد سے حضرت عثمانؓ کی خلافت کے اواخر تک کوفہ کے معلم رہے اور اہل کوفہ کو تعلیم دیتے رہے، اس مدت میں آپ کی درسگاہ فیض رساں سے ہزاروں نے کسب فیض کیا اور سیکڑوں فقیہ، محدث اور مفسر ہوئے، حضرت علیؓ نے جب کوفہ کو دارالخلافہ بنایا تو کوفہ کی بہتر علمی حالت کو دیکھ کر حضرت عبداللہ بن مسعود کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:

رحم الله إبن أم عبد، قد ملأ هذه القرية علماً (فقه اهل العراق وحديثهم، ص: ۵۳)

''اللہ تعالی ابن ام عبد پر رحم فرمائیں، انہوں نے تو اس علاقے کو علم وفضل سے بھر دیا''۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کی خدمات کی تحسین وتعریف کرتے ہوئے فرمایا:

لقد ترك إبن أم عبد يعني إبن مسعود رضى الله عنه هؤلاء سرج هذه القرية (مناقب الامام ابى حنيفة للموفق المكى، ص: ۳۰)

عبداللہ ابن مسعودؓ نے اہل کوفہ کو علم کا چراغ بنا دیا ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علاوہ دیگر سیکڑوں صحابہ کرام اس شہر میں آئے، بعض یہاں کچھ عرصہ اور کچھ سال مقیم رہے اور پھر حجاز کی جانب لوٹ گئے اور بعضوں نے اسی سرزمین میں دفن ہونا پسند کیا، امام عجلیؒ کا قول ماقبل میں گزر چکا ہے کہ پندرہ سو صحابہ کرام یہاں فروکش ہوئے تھے، امام حاکمؒ نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں انچاس ایسے صحابہ کرامؓ کے اسماء گرامی اور ان سے مروی روایت درج کی ہے، جو کوفہ میں آباد ہوئے تھے۔ (معرفۃ علوم الحدیث، ص:۱۱۹)

علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں:

هبط الكوفة ثلاثمائة من أصحاب الشجرة وسبعون من أهل بدر (الطبقات الكبرى، طبقات الكوفيين: ۶/۸۹)

ستر بدریؓ اور تین سو بیعت رضوان میں شریک صحابہ کرامؓ کوفہ میں فروکش اور آباد ہوئے۔

امام ابو بشر دولابیؒ نے سند کے ساتھ مشہور تابعی حضرت قتادہؒ سے روایت نقل کی ہے:

نزل الكوفة ألف وخمسون رجلا من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم وأربعة وعشرون من أهل بدر (الكنى والأسماء لمحمد بن أحمد الدولابى الرازى، حرف الراء: ۲/۵۴۰)

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک ہزار پچاس صحابہ کرامؓ اور چوبیس وہ صحابہ کرامؓ جو غزوۂ بدر میں شریک تھے، کوفہ تشریف لائے۔

امام شمس الدین سخاویؒ کوفہ میں فروکش ہونے والے صحابہ کرامؓ کے اسماء گرامی ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

(والكوفة)نزلها مثل ابن مسعود، وعمار بن ياسر، وعلي بن أبي طالب وخلق من الصحابة رضي الله عنهم (الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ،ص:۲۸۱)

کوفہ میں حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد آ کر فروکش ہوئی۔

امام ابراہیم بن محمد ثقفیؒ جو محدث، مؤرخ اور فقیہ ہے، نے کوفہ کی فضیلت اور کوفہ میں تشریف لانے والے صحابہ کرامؓ کے متعلق ایک مستقل کتاب لکھی ہے، جس کا نام ''فضل الکوفہ ومن نزلہا من الصحابہ'' ہے۔

باب العلم حضرت علیؓ کی کوفہ آمد

حضرت علی المرتضیؓ، جن کو رسالت مآب ﷺ کی بارگاہ سے ''باب العلم'' کا خطاب ملا ہوا ہے، آپؓ نے سنہ ۳۵ھ میں مسند خلافت سنبھالی؛ لیکن حالات کی ناسازگاری اور انتشار کی وجہ سے اپنا دار الخلافہ مدینہ منورہ چھوڑ کر کوفہ منتقل کرنا پڑا اور آپؓ خود بھی کوفہ منتقل ہو گئے، اس طرح کوفہ کی سرزمین کو یہ شرف حاصل ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی خلافت کے چار سال یہیں گزارے، آپ کی کوفہ آمد سے کوفہ کے علمی وتحقیقی افق پر چار چاند لگ گئے اور آپ ﷺ کی آپؓ کے متعلق پیش گوئی ''وافضلهم علي'' کے صحیح مصداق آپ کوفہ میں ہی بنے؛ کیوں کہ آپؓ کی فقہ اور علمی ضیاء پاشیاں یہی کوفہ میں پھیلیں، ایسے ہی آپؓ کے اکثر فیصلے اور قضایا یہی کوفہ میں صادر ہوئے، مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

وكان أغلب قضاياه بالكوفة (حجة الله البالغة، باب كيفية تلقي الأمة الشرع: ۱/۲۷۸)

حضرت علیؓ کے اکثر فیصلے کوفہ میں ہی صادر ہوئے۔

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

وإنما كان غالب علمه في الكوفة (منهاج السنة النبوية، الفصل الأول من منهاج الكرامة: ۷/۵۱۶)

بیشک حضرت علیؓ کا زیادہ تر علم کوفہ میں ہی پھیلا۔

نیز امام ابن تیمیہؒ ایک اور جگہ تحریر کرتے ہیں:

وإنما ظهر علم علي وفقهه في الكوفة بحسب مقامه فيها عندهم مدة خلافته

(منهاج السنة النبوية، الفصل الأول من منهاج الكرامة:۷/۵۱۶)

یقیناً حضرت علیؓ کا علم اور ان کی فقہ کوفہ میں اس قدر ظاہر ہوئی، جتنا کہ آپؓ نے اہل کوفہ کے ہاں قیام کیا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علیؓ کی آمد سے کوفہ کی علمی ترقی میں چار چاند لگ گئے؛ لیکن یہ بالکل غلط نظریہ ہے کہ حضرت علیؓ کی آمد کے بعد یہاں علم کی بنیاد پڑی، جیسا کہ روافض کا نظریہ ہے؛ کیوں کہ آپؓ کی آمد سے قبل ہی حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود اور دیگر صحابہ کرامؓ کو تعلیم دین کے لئے کوفہ روانہ کر دیا تھا، یہ حضرات حضرت علیؓ کی آمد سے قبل ہی اہل کوفہ کو اپنے علم سے خوب سیراب کر چکے تھے؛ چنانچہ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

ولما ذهب إلى الكوفة، كان أهل الكوفة قبل أن يأتيهم قد أخذوا الدين عن سعد بن أبي وقاص، وابن مسعود، وحذيفة، وعمار، وأبي موسى، وغيرهم ممن أرسله عمر إلى الكوفة(منهاج السنة النبوية، الفصل الأول من منهاج الكرامة:۸/۴۹)

حضرت علیؓ جب کوفہ تشریف لے گئے تو اہل کوفہ آپؓ کی آمد سے قبل ہی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت ابوموسی اشعریؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ سے علم حاصل کر چکے تھے، جنہیں حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے پہلے ہی کوفہ بھیج دیا تھا۔

امام ابن تیمیہؒ ایک اور جگہ تحریر کرتے ہیں:

فإن أهل الكوفة التي كانت داره كانوا قد تعلموا الإيمان، والقرآن وتفسيره، والفقه، والسنة من ابن مسعود وغيره، قبل أن يقدم على الكوفة (منهاج السنة النبوية، الفصل الأول من منهاج الكرامة:۷/۵۲۷)

حضرت علیؓ کی آمد سے قبل ہی اہل کوفہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر صحابہ کرامؓ سے ایمان،

قرآن وسنت اور فقہ وتفسیر کا علم حاصل کر چکے تھے۔

اہل کوفہ کا فضل وکمال

سرزمین کوفہ کو صحابہ کرامؓ کی قدم بوسی کا جو شرف حاصل ہوا، اس کی برکت سے کوفہ اور اہل کوفہ نے علم وعمل میں وہ ترقی کی اور فقہ وحدیث میں وہ مقام حاصل کیا کہ عمر بن الخطابؓ جیسی شخصیت جب انہیں پیغام لکھتے تو انہیں اس عنوان سے مخاطب کرتے:

يا أهل الكوفة: أنتم رأس العرب وجمجمتها (المستدرك على الصحيحين، ذكر مناقب عبد الله بن مسعود رضي الله عنه، رقم الحديث: ۵۳۷۹)

اے اہل کوفہ: تم عرب کا دماغ اور ان کے سر کی چوٹی ہو۔

حضرت عمرؓ کوفہ اور اہل کوفہ کے تعلق سے یہ بھی فرماتے تھے کہ:

قال عمر بن الخطاب: بالكوفة وجوه الناس (التاريخ الكبير المعروف لابن أبي خيثمة، سنة عشر: ۳۸۱/۲)

کوفہ میں بڑے بڑے لوگ ہیں۔

نیز حضرت عمرؓ اہل کوفہ کو کبھی ''راس الاسلام'' اور کوفہ کو ''رمح اللہ'' اور کبھی ''کنز الایمان'' جیسے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔

حضرت سلمان فارسیؓ کوفہ اور اہل کوفہ کے متعلق فرماتے تھے:

الكوفة قبة الإسلام وأهل الإسلام (الطبقات الكبرى لابن سعد، طبقات الكوفيين: ۸۶/۶)

سرزمین کوفہ اسلام اور مسلمانوں کا قبہ ہے۔

امام نووی شافعیؒ فرماتے ہیں:

والكوفة هي البلدة المعروفة ودار الفضل ومحل الفضلاء (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، كتاب الصلاة، باب القراءة في الظهر والعصر: ۱۷۵/۴)

کوفہ علم وفضل کا گھر اور فضلاء کا مقام ہے۔

اور امام ابوحنیفہؒ نے کوفہ کو ''معدن العلم والفقہ'' قرار دیا ہے، مشہور محدث سفیان بن عیینہؒ فرماتے تھے: تم

افعال حج اور مناسک تو اہل مکہ سے حاصل کرو اور قرآن اہل مدینہ سے؛ لیکن:

وخذوا الحلال والحرام عن أهل الكوفة (معجم البلدان لياقوت الحموى، باب الكاف والواو وما يليهما، الكوفة: ۴/۴۹۳)

حلال وحرام کے مسائل تم اہل کوفہ سے حاصل کرو۔

اور انہوں نے مزید فرمایا:

من أراد المغازى فالمدينة، ومن أراد المناسك فمكة، من أراد الفقه فالكوفة يلازم أصحاب أبي حنيفة (شرح مسند أبي حنيفة لملا على القارى، التعجب انفعال النفس: ۱/۳۴)

جو مغازی اور جنگوں کے حالات معلوم کرنا چاہتا ہے، وہ اہل مدینہ سے حاصل کرے اور مناسک حج اہل مکہ سے سیکھے؛ لیکن، جو فقہ وفقاہت کا خواہشمند ہو، وہ کوفہ کے اہل علم کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن عبد البرؒ نے کوفہ کے تعارف میں لکھا ہے کہ:

وكان بها العلماء والعباد والفضلاء وأهل الأدب والفقهاء وأهل العلم (الاستذكار لابن عبد البر، كتاب الاستئذان، باب ما جاء فى المشرق؛ ۸/۵۲۰، رقم الحديث: ۱۸۲۶)

کوفہ علماء، عابدین، فضلاء، ادباء وفقہاء اور اہل علم کا مسکن تھا۔

یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ کوفہ صرف فقہ ہی کیلئے مشہور نہیں تھا؛ بلکہ وہ علم حدیث کا بھی اچھا خاصا مرکز تھا، اور ہزاروں طلبۂ حدیث وہاں آکر اپنی تشنگی کو سیراب کرتے تھے، چنانچہ مشہور تابعی محمد بن سیرین فرماتے ہیں:

قدمت الكوفة وبها أربعمائة آلاف يطلبون الحديث (تدريب الراوى، ص ۲۷۵)

میں جب کوفہ آیا تو وہاں حدیث کے چار ہزار طالب علم تھے۔

نامور محدث بغداد عفان بن مسلم فرماتے ہیں:

قدمنا الْكُوفَة فَأَقَمْنَا أَرْبَعَة أشهر وَلَو أردنَا أَن نكتب مائَة ألف حَدِيثا لكتبناها، فَمَا كتبنَا إِلَّا قدر خمسين ألف حَدِيث، .... وَمَا رَأينَا بِالْكُوفَةِ لحاناً

مجوزا (مقدمة نصب الراية، ۱/۲۴)

ہم نے کوفہ میں آ کر چار ماہ قیام کیا، اگر ہم ان چار ماہ میں ایک لاکھ احادیث لکھنا چاہتے تو لکھ سکتے تھے؛ لیکن ہم نے (احتیاط کی بناء پر) صرف چار ماہ میں پچاس ہزار احادیث لکھیں، مزید فرماتے ہیں: ہم نے کوفہ میں عربی زبان میں غلطی کرنے والا اور اس کو روا سمجھنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔

امام ابوبکر عبداللہ بن ابوداوٗد فرماتے ہیں:

دخلت الكوفة ومعي درهم واحد فاشتريت به ثلاثين مداً باقلاء فكنت آكل منه وأكتب عن الأشج فما فرغ الباقلاء حتى كتبت عنه ثلاثين ألف حديث ما بين مقطوع ومرسل (طبقات الحفاظ للذهبی: ۲/ ۲۳۶)

جب میں کوفہ آیا تو میرے پاس صرف ایک ہی درہم تھا، چنانچہ میں نے تیس مد (تقریباً ایک رطل اور ایک پونڈ کا ہوتا ہے) کا باقلاء خریدلیا؛ چنانچہ میں باقلاء کھاتا رہا اور شیخ سے حدیث لکھتا رہا، باقلاء کے ختم ہونے تک میں نے اپنے شیخ سے تیس ہزار احادیث لکھیں، جن میں مقطوع، مرسل احادیث بھی شامل ہیں۔

امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری نے بھی طلب حدیث کیلئے الگ الگ کئی ملکوں کا سفر کیا؛ لیکن اس کے باوجود وہ کوفہ اور بغداد بار بار حاضر ہوتے تھے؛ چنانچہ خود ان کا اپنا ارشاد ہے:

لا أحصي كم دخلت إلى الكوفة وبغداد مع المحدثين (فتح الباری لابن حجر: ۴۸/۴)

مشہور محدث عبداللہ بن احمد نے اپنے والد حضرت امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ طلب علم کیلئے ایک ہی استاد کی خدمت میں رہنا چاہئے یا دیگر مقامات کا بھی سفر کرنا چاہئے تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا:

يرحل ويكتب من الكوفيين والبصريين وأهل المدينة ومكة (تدريب الراوی، ص:۱۷۷، فتح المغيث، ص:۳۲۱)

سفر اختیار کرنا چاہئے اور کوفہ، بصرہ، مدینہ اور مکہ کے لوگوں سے علم حاصل کرنا چاہئے۔

ان تمام عبارات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر ایک انصاف پسند قاری اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتا ہے کہ کوفہ صرف رائے وفقہ کا مرکز نہیں تھا؛ بلکہ وہ حدیث اور علوم حدیث کا بھی مرکز تھا، چنانچہ امام اہل سنت ومقتدائے

ملت امام احمد بن حنبلؒ نے جن مقامات کا تذکرہ کیا، ان میں کوفہ کو اول نمبر پر بیان کیا ہے۔

اہل کوفہ اور علم حدیث

کوفہ دیگر علوم وفنون کی طرح علم حدیث اور محدثین کا بھی بڑا مرکز اور گہوارہ تھا، یہاں علوم حدیث اور محدثین کی کثرت اور بہتات تھی، فقہ وفتاوی کے ساتھ ساتھ علم حدیث کی مسندیں بھی یہاں آباد تھیں، فکر ونظر کی اس سرزمین پر جہاں فقہ وفتاوی میں عمق اور درک رکھنے والے اساطین علم موجود تھے، وہی علم حدیث کی فنی باریکیوں سے آشنا افراد کی بھی بڑی تعداد موجود تھی، علوم الحدیث کی اس وسعت کا اثر اہل کوفہ پر بھی تھا؛ چنانچہ اہل کوفہ میں احادیث رسول ﷺ کے سننے اور جمع کرنے کا شوق بھی بہت تھا، جب کبھی مدینہ منورہ سے کسی صحابی کی کوفہ آمد ہوتی تو اہل کوفہ فرامین نبوی ﷺ سننے اور جمع کرنے کی غرض سے صحابی رسول ﷺ کے پاس جمع ہو جاتے تھے، امام ابن ماجہؒ نے ایک واقعہ اپنی سنن میں نقل کیا ہے، جو اس پر شاہد عدل ہے:

> عن الشعبي، قال: لما قدم عدي بن حاتم الكوفة، أتيناه في نفر من فقهاء أهل الكوفة، فقلنا له: حدثنا ما سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم (سنن ابن ماجه، أبو اب السنة، باب في القدر، رقم الحديث: ٨٧)
>
> امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عدی بن حاتمؓ کوفہ تشریف لائے تو ہم لوگ کوفہ کی فقہاء کی جماعت کے ساتھ ان کی خدمت میں تشریف لائے اور ان سے درخواست کی کہ ہمیں رسول کعیم ﷺ کی کوئی بات سنا دیجئے، جس پر انہوں نے ہمیں حدیث رسول ﷺ سنائی۔

علماء کوفہ کو احادیث جمع کرنے کا شوق اس قدر زیادہ تھا کہ انہوں نے کوفہ میں علم حدیث کی وسعت، محدثین کی کثرت اور کوفہ میں موجود صحابہ کرامؓ سے کثرت سے سماعت حدیث کے باوجود مزید سماعت حدیث کے لئے بلاد اسلامیہ کی جانب رحلت کی؛ بالخصوص انہوں نے مرکز اسلام مدینہ منورہ کی جانب رحلت کی اور وہاں موجود صحابہ کرامؓ؛ بالخصوص حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے احادیث اخذ کیا، چنانچہ حافظ سخاویؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے:

> وكان أصحاب عبد الله يرحلون من الكوفة إلى المدينة فيتعلمون من عمر و يسمعون منه (فتح المغيث بشرح الفية الحديث للعراقي، آداب طالب الحديث: ٣٣٣/٣)
>
> حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ کوفہ سے مدینہ منورہ کی جانب سفر کرتے تھے اور وہاں

حضرت عمرؓ سے علم حاصل کرتے تھے اور حدیث کی سماعت کرتے تھے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

وکانوا یذھبون إلی المدینة فیأخذون عن عمر وعائشة (منهاج السنة النبویة، الثالث: ۵۲۸/۷)

اہل کوفہ مدینہ منورہ کا سفر کرتے تھے اور حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے علم حاصل کرتے تھے۔

امام ابن تیمیہؒ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

وأصحاب ابن مسعود کانوا یأخذون عن عمر وعلی وأبی الدرداء وغیرھم (منهاج السنة النبویة: ۴۸/۸)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ سے علم حاصل کرتے تھے۔

محدثین کوفہ کی عظمت وشہرت

کوفہ ائمۂ حدیث اور حفاظ حدیث سے بھرا ہوا تھا، جن ائمۂ حدیث نے دنیائے علم فن پر اپنی عظمت و شہرت کے جھنڈے گاڑے ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق اسی سرزمین سے تھا، علم حدیث کے تعلق سے اس سرزمین کی شہرت وعظمت مسلسل تین سو سال تک مسلم رہی ہے، چنانچہ امام ابوسعد سمعانیؒ کوفہ کے متعلق لکھتے ہیں:

وھی من أمھات بلاد المسلمین، بنیت فی زمان عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ، خرج منھا جماعة من العلماء والمحدثین قدیما وحدیثا، وفیھم شھرة استغنینا عن ذکرھم لشھرتھم (الأنساب للسمعانی، حرف الکاف، الکوفی: ۱۶۲/۱۱)

کوفہ مسلمانوں کے بنیادی مقامات میں سے ایک ہے، یہ شہر دورفاروقی میں تعمیر کیا گیا، یہاں سے ہر زمانے میں ایسے علماء ومحدثین کی جماعت نکلتی رہی ہیں کہ جن کی شہرت وعظمت کی وجہ سے ان کا تذکرہ یہاں کرنا بے جا ہے۔

کوفہ کی دیگر علوم میں شہرت اور علم حدیث میں ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے محدثین بھی علم حدیث میں علماء کوفہ کے محتاج رہے ہیں، امام ابن سعدؒ نے مکة المکرمہ کے سب سے بڑے عالم امام عطاء ابن رباحؒ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ایک کوفی شخص نے عطاء ابن رباحؒ

سے کچھ مسائل پوچھے، جس کے جواب میں انہوں نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی؛

أخبرنا عبد الجبار بن عباس، عن أبيه، قال: جالست عطاء، فجعلت أسائله فقال لي: ممن أنت؟ فقلت: من أهل الكوفة. فقال عطاء: ما يأتينا العلم إلا من عندكم (الطبقات الكبرى لابن سعد، الطبقة الرابعة، طبقات الكوفيين: ١١/٦)

عبد الجبار بن عباس اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں عطاء ابن رباح کی مجلس میں تھا، میں نے عطاء ابن رباحؒ سے سوال کرنا شروع کیا تو انہوں نے پوچھا کہ آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ میرا تعلق کوفہ سے ہے، جس پر انہوں نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ''ہمارے پاس جو علم ہے، وہ کوفہ ہی سے ہمارے پاس منتقل ہوتا ہے''۔

امام ابن خثیمہؒ نے امام سفیان بن عیینہؒ سے ایک حدیث کے بارے میں یہ بات نقل کی ہے:

قال سفيان: ولا يعرف أهل مكة هذا الحديث، وإنما جاء من قبل العراق (تاريخ ابن أبي خيثمة، في سنة إحدى: ٢٨٠/١)

امام سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے اہل مکہ واقف نہیں ہیں، یہ حدیث اہل عراق کی طرف سے آئی ہے۔

مشہور ائمۂ حدیث ورجال حضرت علقمہ بن قیسؒ، مسروقؒ، اسود بن یزید نخعیؒ، ابوعبدالرحمن سلمیؒ، ابراہیم نخعیؒ، سعید بن جبیرؒ، عامر شعبیؒ، منصور بن معتمرؒ، امام اعمشؒ، امام ابوحنیفہؒ، مسعر بن کدامؒ، سفیان ثوریؒ، حسن بن صالحؒ، یحیٰ بن زکریا بن ابی زائدہؒ، امام وکیع بن جراحؒ اور امام حفص بن غیاثؒ جیسے کبار محدثین اور ائمۂ حدیث، جن کی کتب سے کتب احادیث بھری پڑی ہیں، وہ سب یہی کوفہ کے مکین تھے، محدث کبیر امام حاکم نیشاپوریؒ نے ''معرفۃ علوم الحدیث'' میں بلاد اسلامیہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، شام، یمن، یمامہ، کوفہ، جزیرہ اور دیگر بلاد اسلامیہ کے ان محدثین کا تذکرہ کیا ہے اوران کی تعداد ذکر کی ہے، ان میں مکہ مکرمہ کے صرف ۴۰ اور مدینہ منورہ کے صرف ۲۱ محدثین کا تذکرہ کیا ہے؛ لیکن کوفہ کے محدثین کی تعداد ۲۱۰ ذکر کی ہے، اس سے آپ کوفہ میں محدثین کی کثرت اوران کی شہرت وعظمت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں، کوفہ کے محدثین کی عظمت شان اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ مشہور کتب احادیث؛ بالخصوص صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں کوفی محدثین کی روایات بکثرت موجود ہیں، امام شمس الدین ذہبیؒ نے امام مالکؒ کے ترجمہ میں یہ بات نقل کی ہے:

وفي "الصحيحين" شيء كثير جدا من رواية العراقيين -رحمهم الله (سير أعلام

النبلاء، مالك الإمام: ۱۶۳/۷)

امیر المومنین فی الحدیث حضرت امام بخاری کے سن وفات 252ھ تک کوفہ کے محدثین کی تحقیق وجستجو کی گئی تو ان کی تعداد مختلف کتب تراجم ورجال میں سینکڑوں سے متجاوز نکلی، طوالت کے باعث ہر ایک کا نام ذکر کرنا ممکن نہیں، چند نمایاں اسمائے گرامی ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں۔

نمبر	نام	وفات
(۱)	علقمہ بن قیس	۶۲ھ
(۲)	مسروق بن الاجدع	۶۳ھ
(۳)	عبیدہ بن عمرو المرادی	۷۲ھ
(۴)	اسود بن یزید	۷۵ھ
(۵)	سوید بن غفلۃ	۸۱ھ
(۶)	زر بن جیش	۸۲ھ
(۷)	ربیع بن الخیثم	۶۳ھ
(۸)	عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ	۷۳ھ
(۹)	ابوعبدالرحمن السلمی	۷۳ھ
(۱۰)	شریح بن حارث	۷۸ھ
(۱۱)	ابووائل شقیق بن سلمہ	۸۲ھ
(۱۲)	قیس بن ابی حازم	۹۷ھ
(۱۳)	عمرو بن میمون	۷۵ھ
(۱۴)	زید بن وہب جہنی	۸۴ھ
(۱۵)	معرور بن سوید	۸۴ھ
(۱۶)	ابوعمرو بن شیبانی	۹۸ھ
(۱۷)	ربعی بن حراش	۱۰۱ھ
(۱۸)	ابراہیم تیمی	۹۲ھ
(۱۹)	ابراہیم نخعی	۹۵ھ

(۲۰)	سعید بن جبیر	۹۵ھ
(۲۱)	عامر بن شراحیل شعبی	۱۰۳ھ
(۲۲)	ابواسحاق سبیعی	۱۲۷ھ
(۲۳)	حبیب بن ابی ثابت	۱۱۹ھ
(۲۴)	حکم بن عتیبہ	۱۱۵ھ
(۲۵)	عمرو بن مرہ	۱۱۶ھ
(۲۶)	قاسم بن مخیمرہ	۱۱۱ھ
(۲۷)	عبدالملک بن عمیر	۱۳۶ھ
(۲۸)	منصور بن معتمر	۱۳۰ھ
(۲۹)	مغیرہ بن مقسم	۱۳۰ھ
(۳۰)	حصین بن عبدالرحمٰن	۱۳۰ھ
(۳۱)	ابواسحاق الشیبانی	۱۳۰ھ
(۳۲)	اسماعیل بن ابی خالد	۱۴۵ھ
(۳۳)	سلیمان بن مہران اعمش	۱۴۸ھ
(۳۴)	عبدالملک بن سلیمان المغربی	۱۴۵ھ
(۳۵)	محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلی	۱۴۸ھ
(۳۶)	حجاج بن ارطاۃ	۱۴۹ھ
(۳۷)	مسعر بن کدام	۱۷۵ھ
(۳۸)	مسعودی	۱۶۰ھ
(۳۹)	سفیان بن سعید ثوری	۱۶۱ھ
(۴۰)	اسرائیل بن یونس	۱۶۲ھ
(۴۲)	زائدہ بن قدامہ	۱۶۱ھ
(۴۳)	حسن بن صالح بن حی	۱۶۹ھ
(۴۴)	شیبان بن عبدالرحمٰن	۱۶۴ھ

(۴۵)	قیس بن ربیع	۱۶۷ھ
(۴۶)	ورقاء بن عمرو بن کلیب	۱۶۰ھ
(۴۷)	شریک بن عبداللہ قاضی	۱۷۷ھ
(۴۸)	زہیر بن معاویہ	۱۷۳ھ
(۴۹)	قاسم بن معن	۱۷۵ھ
(۵۰)	ابواحوص سلام بن سلیم	۱۹۷ھ
(۵۱)	عبثر بن قاسم	۱۷۸ھ
(۵۲)	سفیان بن عیینہ	۱۹۸ھ
(۵۳)	ابوبکر بن عیاش	۱۹۳ھ
(۵۴)	یحیی بن زکریا بن ابی زائدہ	۱۸۲ھ
(۵۵)	عبدالسلام بن حرب	۱۸۷ھ
(۵۶)	جریر بن عبدالحمید	۱۸۸ھ
(۵۷)	ابوخالد احمر	۱۸۹ھ
(۵۸)	ابواسحاق فزاری	۱۸۵ھ
(۵۹)	عیسی بن یونس	۱۸۷ھ
(۶۰)	عبداللہ بن ادریس	۱۹۲ھ
(۶۱)	یحیی بن یمان	۱۸۹ھ
(۶۲)	حمید بن عبدالرحمن	۱۹۰ھ
(۶۳)	علی بن مسہر	۱۸۹ھ
(۶۴)	عبدالرحمن بن سلیمان	۱۸۷ھ
(۶۵)	ابومعاویہ	۱۹۵ھ
(۶۶)	مروان بن معاویہ	۱۹۳ھ
(۶۷)	حفص بن غیاث	۱۹۴ھ
(۶۷)	وکیع بن الجراح	۱۹۷ھ

(۶۸)	اشجعی	۱۸۲ھ
(۶۹)	عبدہ بن سلیمان	۱۸۸ھ
(۷۰)	محاربی	۱۹۵ھ
(۷۱)	محمد بن فضیل بن غزوان	۱۹۵ھ
(۷۲)	ابواسامہ	۲۰۱ھ
(۷۳)	محمد بن بشر	۲۰۳ھ
(۷۴)	یحیی بن سعید بن ابان	۱۹۴ھ
(۷۵)	یونس بن بکیر	۱۹۹ھ
(۷۶)	عبداللہ بن نمیر	۱۹۹ھ

●●●

فتاوی ہندیہ کے بعض اہم قلمی مصادر (۳)

محمد بن عبداللہ ندوی
(رفیق شعبۂ تحقیق، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

فتاوی ہندیہ کے قلمی مصادر کی یہ تیسری کڑی ہے، دو قسطیں اس قبل شائع ہوچکی ہیں، راقم الحروف نے اس سلسلہ میں صرف انہیں مصادر کا تعارف ذکر کیا ہے جواب تک مخطوطہ کی شکل میں ہے، یا پھر وہ حال حال میں طبع ہوئی ہیں۔

الحاوی فی الفتاوی للحصیری

فقہ حنفی میں حاوی نام سے کئی کتابیں ہیں، جن میں پہلی: محمد بن ابراہیم بن انوش ابو بکر حصیری بخاری (متوفی: 505ھ) کی ''الحاوی فی الفتاوی'' ہے[1]، دوسری: نجم الدین ابوشجاع وابو الفضائل بکبرس ترکی (متوفی: 652ھ) کی ''الحاوی فی الفقہ''، یہ مختصر القدوری کی طرح ایک مختصر تصنیف ہے[2]، تیسری: قاضی جمال الدین احمد بن محمد بن نوح قابسی غزنوی (متوفی: 593ھ) کی '' الحاوی القدسی'' ہے[3]، چوتھی: شیخ ابو الرجاء نجم الدین مختار بن محمود الزاہدی غزمینی حنفی (متوفی: 685ھ) کی ''الحاوی للزاہدی''، جس کا پورا نام ''حاوی مسائل الواقعات و المنیہ وما ترکہ فی تدوینہ من مسائل القنیہ وزاد فیہ من الفتاوی لتتمیم الغنیہ'' ہے۔[4]

---

(۱) كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون :1/ 624، الأعلام للزركلي:5/ 295،الفوائد البهية في تراجم الحنفية،ص: 246،سلم الوصول إلى طبقات الفحول:52/3،،هدية العارفين:79/1،

(۲) كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون :628/1، الجواهر المضية في طبقات الحنفية :1/ 170،تاج التراجم لابن قطلوبغا، ص: 143۔الفوائد البهية في تراجم الحنفية (ص: 56)

(۳) كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون :1/ 627، الفوائد البهية في تراجم الحنفية،ص: 246،سلم الوصول إلى طبقات الفحول:237/1،هدية العارفين:89/1،تاريخ إربل:175/2-

(۴) كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون :1/ 628، الفوائد البهية في تراجم الحنفية،ص: 212،،هدية العارفين:423/2، تاريخ إربل:175/2-

پانچویں: شیخ ابونصر احمد بن منصور ظفری خجندی اسبیجابی (متوفی:480ھ) کی الحاوی شرح مختصر الطحاوی ہے۔(۱)

فتاوی ہندیہ میں تین حاوی کے مسائل آئے ہیں، ایک علامہ حصیری کی ''الحاوی فی الفتاوی'' کے، دوسرا ''الحاوی القدسی'' کے اور تیسرا جس ''حاوی'' کے حوالے آئے ہیں، تلاش بسیار کے باوجود بھی راقم کو اس کا کہیں سراغ نہیں لگ سکا؛ حالانکہ اس حاوی سے فتاوی عالمگیری میں بہت زیادہ مسائل لیے گئے ہیں، اور ''کذا فی الحاوی'' یا ''ھکذا فی الحاوی'' کی تعبیر کے ساتھ مسائل نقل کئے گئے ہیں، عام طور پر اس حاوی کے مسائل دو کتابوں میں ہو بہو یا تھوڑے بہت فرق کے ساتھ مل جاتے ہیں، ایک امام محمد کی کتاب الاصل معروف بہ المبسوط اور دوسرے علامہ سرخسی کی المبسوط، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ حاوی کسی متقدم فقیہ کی تصنیف ہو؛ چونکہ عام طور سے اس کے مسائل امام محمد اور امام سرخسی ہی کی کتابوں میں ہی ملتے ہیں، دوسرے مصنفین کی کتابوں میں بہت کم اس کے مسائل ملتے ہیں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف کون ہیں؟ یہ کتاب دستیاب بھی ہے یا نہیں؟ ممکن ہے یہ کتاب اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی لائبریری میں رہی ہو؛ لیکن حوادث زمانہ نے اسے اہل علم کی نظروں سے اور کتب خانوں سے دور کر دیا ہو، یا پھر وہ کہیں ایسی جگہ موجود ہو جہاں ابھی اہل علم کی نگاہیں نہ پہونچیں ہو۔

امام حصیریؒ کی حاوی کو فقہ حنفی میں بہت ہی معتبر اور معتمد علیہ سمجھا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب سے متعدد اہل علم نے استفادہ کیا ہے، جن میں سرفہرست صاحب محیط برہانیؒ، علامہ فخر الدین زیلعیؒ، علامہ طرابلسیؒ، علامہ بدر الدین عینیؒ، علامہ ابن ہمامؒ، ملا محمد خسروؒ، علامہ ابن نجیمؒ، علامہ حصکفیؒ، علامہ ابن عابدین شامیؒ، علامہ شرنبلالیؒ، محمد بن شہاب بزاز کردی صاحب فتاوی بزازیہ وغیرہ ہیں، حاجی خلیفہ اس کتاب کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> وهو أصل من أصول كتب الحنفية وفيه شيء كثير من فتاوى المشايخ يُرجع إليه ويعتمد عليه.(۲)

امام حصیریؒ اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے فقیہ ابو احمد محمد بن ولید زاہد سمرقندیؒ کی الجامع الاصغر، ابو عباس ناطفیؒ کی واقعات واجناس، عظیم فقیہ ابوبکر محمد بن فضل بخاریؒ اور ابو اللیث سمرقندیؒ کے فتاوی، مشائخ بخاری وسمرقند کے فتاوی، امام نجم الدین عمر نسفیؒ کے فتاوی سے مسائل کا انتخاب کر کے اپنی اس

(۱) الفهرس الشامل للتراث العربي:56/ 18، مصادر الدراسات الاسلاميه: 201/4، فهرس مكتبه فاضل احمد تركى، ص: 289-

(۲) كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون :1/ 624-

کتاب میں یکجا کر دیا ہے، نیز طلبہ کی سہولت کی غرض سے اکثر مسائل کے مراجع کو بھی نقل کیا ہے، ساتھ ہی اس کتاب کو اقسام، ابواب اور فصول میں خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دیا ہے، اور اس کا نام ''الحاوی فی الفتاوی'' رکھا ہے۔

امام حصیریؒ نے اپنی اس کتاب کے فقہی ابواب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے: پہلا حصہ: عبادات وقربات سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ: لین دین، خرید وفروخت اور مباح امور سے متعلق مسائل پر محیط ہے، تیسرا حصہ: ممنوعات اور قابل مذمت امور سے متعلق ہے، چوتھا حصہ: جرم اور سزاؤں سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے، نیز آپ نے ہر حصہ کو ابواب میں، پھر ہر باب کو فصلوں میں تقسیم کیا، کتاب کے آخر میں ایک قسم ''القسم الاخیر'' کے عنوان سے ذکر کیا ہے، جو آٹھ فصلوں میں منقسم ہے، جس میں مختلف موضوعات جیسے کہ علماء سلف کے عقائد، ان کی حسن سیرت، بدعات، بدعات کے سلسلہ میں علماء سلف کے طریقۂ کار، کار فتوی اور اس سلسلہ میں احتیاط، فقہ کی عظمت اور اس سے متعلق اقتباسات، امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمد بن الحسنؒ کے مناقب اور دیگر فقہاء کے حالات وحسن معاملات پر بہت عمدہ گفتگو کیا ہے، اور کتاب کو اس شعر کے ساتھ مکمل کیا ہے:

اذا اهل الكرامة اكرموني   فلا اخشى الهوان من اللئام [1]

امام حصیری کے اس حاوی کو ''الحاوی للفتاوی، یا الحاوی فی الفتاوی اور حاوی الحصیری بھی کہا جاتا ہے، فتاوی عالمگیری میں اس سے متعدد مسائل ماخوذ ہیں، اور جہاں بھی کوئی مسئلہ نقل کیا گیا ہے تو وہاں'' كذا ياهكذا فى الحاوى للفتاوى'' یا ''الحاوى فى الفتاوى'' یا ''الحاوى للحصيرى'' لکھا ہے، اور جہاں حاوی قدسی سے مسائل لیے گئے ہیں تو وہاں واضح طور پر ''كذا يا هكذافى الحاوى القدسى'' ذکر کر دیا گیا ہے۔

حاوی حصیری کا سب سے قدیم نسخہ ترکی کے مکتبہ کوبریلی میں ہے، جس کو ابو بکر ابن الحسین بن علی ترمذی نے ۵۷۸ھ مطابق ۱۱۸۲ء میں لکھا ہے، یہ نسخہ ۴۳۹/صفحات پر مشتمل ہے، یہ ایک واضح، تصحیح شدہ اور تقابل کیا ہوا نسخہ ہے۔

حاوی حصیری اب تک طبع نہیں ہوئی ہے، البتہ بغداد کی ایک یونیورسٹی جامعۃ الامام الاعظم میں اس پر تحقیقی کام چل رہا ہے، اس کتاب کے قلمی نسخے مختلف مکتبات میں ہے، جن میں سے بعض یہ ہیں:

---

(۱) دیکھئے: الحاوی فی الفتاوی للحصیری، مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1010۔

1- مکتبہ کوبریلی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 674۔
2- مکتبہ ولی الدین جار اللہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: 627۔
3- مکتبہ شہید علی پاشا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1018۔
4- مکتبہ البلدیہ بالاسکندریہ، قاہرہ، مخطوطہ نمبر: 1720ب
5- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1010(۱)۔

معدن الحقائق شرح کنز الدقائق

کنز الدقائق کی بہت سی شروحات لکھی گئی ہیں، جن میں بعض مفصل ومطول، بعض متوسط اور بعض مختصر ہیں، انہیں شروحات میں ایک متوسط شرح معدن الحقائق ہے، اس کے مصنف محمد بن حاجی بن محمد بن حسن سمرقندی ہیں، آپ آٹھویں صدی کے اہل علم میں ہیں، جیسا کہ الفہرس الشامل میں ذکر ہے، جبکہ خزانۃ التراث میں آپ کا شمار گیارھویں صدی کے علماء میں کیا ہے اور تاریخ وفات 1096ھ ذکر کیا ہے۔

مصنف علیہ الرحمہ اس شرح کی سبب تصنیف کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ جب میں نے کنز الدقائق پڑھنے والے طلبہ میں اس کتاب کے تئیں زیادہ دلچسپی کو دیکھی تو اس کتاب کی ایک ایسی شرح لکھنے کی خواہش ہوئی جو اس کی پیچیدگیوں کو واضح کرنے والی ہو، اس کی گتھی سلجھانے والی ہو، اس کے قیود واشارات کو حل کرنے والی ہو، اس کے مسائل کی صحیح تصویر کشی کرنے والی ہو، اختلافات اور اطلاقات کو بیان کرنے والی ہو، نیز ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اس میں بہت سے ایسے اہم فوائد کو شامل کردیا ہے، جن پر فتوی کا دار ومدار ہے، اور میں نے اس کا نام ''معدن الحقائق'' رکھا ہے(۲)۔

مصنفؒ کا اس کتاب کے اندر منہج یہ ہے کہ پہلے کنز کے متن نقل کرتے ہیں، پھر اس کی شرح آسان زبان میں کرتے ہیں، لغوی تشریح بھی کرتے ہیں، ائمہ کے اختلافات کو بھی مختصراً نقل کرتے ہیں، اور ضروری اہم جزئیات کو بھی ذکر کردیتے ہیں، کتاب کی ترتیب کنز ہی کی ترتیب پر ہے۔

فتاوی ہندیہ میں کنز الدقائق کی چھ شرحوں سے مسائل لئے گئے ہیں، جن میں تبیین الحقائق کے حوالے ''كذا في التبيين'' کے الفاظ سے، رمز الحقائق کے حوالے ''كذا في العيني شرح الكنز'' کے الفاظ سے، البحر الرائق کے حوالے ''كذا في البحر'' کے الفاظ سے، النہر الفائق کے حوالے ''كذا في النهر

---

(۱) الفہرس الشامل: 56/ 23-22، نیز دیکھئے: خزانۃ التراث-فہرس مخطوطات: 75/ 265۔
(۲) معدن الحقائق، صفحہ نمبر: ۱، خ: مکتبہ اکادمیۃ العلوم فی جمہوریۃ تاجکستان، مخطوطہ نمبر: 1583، نیز دیکھئے: مکتبہ دار الکتب الخلیلیہ، حیدر آباد، انڈیا، مخطوطہ نمبر: 18۔

الفائق'' کے الفاظ سے، الایضاح لقوجحصاری کے حوالے ''کذا فی الایضاح شرح الکنز'' کے الفاظ سے، اور معدن الحقائق کے حوالے ''کذا فی المعدن'' کے الفاظ سے۔

معدن الحقائق کے فتاوی ہندیہ میں چار حوالے آئے ہیں، جن میں تین ''کذا'' کے ساتھ، جبکہ ایک ''ھکذا'' کے ساتھ، یہ کتاب اب تک مخطوطہ کی شکل میں ہے، جس کا قلمی نسخہ متعدد مکتبات میں دستیاب ہے، جن میں سے بعض یہ ہیں:

1- مکتبہ مجلس شوری اسلامی ایران، مخطوطہ نمبر: 19097۔
2- مکتبہ اکادمیۃ العلوم فی جمہوریۃ تاجکستان، مخطوطہ نمبر: 1583۔
3- مکتبہ دار الکتب الخلیلیہ، حیدر آباد، انڈیا، مخطوطہ نمبر: 18۔
4- مکتبہ المتحف العراقی، بغداد، مخطوطہ نمبر: 2437۔
5- مکتبہ رضا، رامپور، مخطوطہ نمبر: [(2405)M-4537](۱)۔

الفتاوی الظہیریہ

فتاوی ہندیہ میں جن کتابوں کے بکثرت حوالے آتے ہیں، ان میں ایک فتاوی ظہیریہ ہے، اس کتاب کا شمار فقہ حنفی کے معتبر اور مستند مراجع میں ہوتا ہے، اور ہر زمانہ میں علماء اور اہل علم کے درمیان مقبول و متداول رہی ہیں، اس کے مصنف محمد بن احمد بن عمر ظہیر الدین بخاری (متوفی: 619ھ) ہیں، آپ دینی علوم میں اصول وفروع کی مہارت کے اعتبار سے یکتائے زمانہ تھے، اور ایک جلیل القدر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ بخارا کے قاضی اور محتسب بھی تھے، آپ نے اپنے والد احمد بن عمر سے علم حاصل کیا اور فقہ میں بلند مقام کے حامل ہوئے، آپ کے اساتذہ میں ایک شیخ ظہیر الدین ابوالمحاسن حسن بن علی مرغینانی ہیں، جو اپنے اس شاگرد کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور دیگر طلبا پر فوقیت دیتے تھے(۲)۔

مصف علیہ الرحمہ اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں: میں نے اپنی کتاب میں واقعات ونوازل سے ایسے مسائل کو جمع کیا ہے، جس کی بہت زیادہ ضرورت پڑتی ہے، تاکہ یہ کتاب اہل علم کے لئے زاد راہ اور

(۱) الفہرس الشامل: 174/27، نیز دیکھئے: کشف الظنون: 2/1516، خزانۃ التراث-فہرس مخطوطات: 48/631۔
(۲) کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون: 2/ 1226، الفوائد البھیۃ فی تراجم الحنفیۃ، ص: 156، ھدیۃ العارفین: 111/2، معجم تاریخ التراث الاسلامی: 2536/4، کتائب اعلام الاخیار: 69/3، ترجمہ نمبر: 427، الفقہ النافع، ص: 51۔

سہارا بنے(۱)۔

فتاویٰ ظہیریہ سے بعد کے تقریباً تمام فقہاء احناف نے استفادہ کیا ہے اور اپنی اپنی کتابوں میں حوالے نقل کیا ہے، جس سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت اور مقبولیت کا پتہ چلتا ہے، کثرت مسائل اور جزئیات کے اعتبار سے یہ ایک انسائیکلو پیڈیا سے کم نہیں ہے، علامہ بدر الدین عینی (متوفی: 855ھ) نے اس کتاب کے ان مسائل کو جس کی بہت زیادہ ضرورت ہے پیش آتی ہیں، ایک جگہ یکجا کر دیا ہے، اور اس کو المسائل البدریہ کا نام دیا ہے، علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> جب میں نے فتاویٰ ظہیریہ کو دیکھا تو میں نے اسے ایک ایسی کتاب پایا جو نوادر ونایاب مسائل واقوال پر مشتمل ہے جس کی ضرورت مفتی اور مستفتی کو فتوی دیتے وقت پیش آتی ہے، نیز یہ ایک ایسی کتاب ہے جو متقدمین کی کتابوں کے مسائل پر مشتمل ہے جس سے علماء متاخرین مستغنی نہیں ہو سکتے؛ لہذا میں نے اس کتاب سے اہم اور پیش آمدہ مسائل کا انتخاب کر کے انہیں ''المسائل البدریہ المنتخبہ من الفتاوی لاظہیریہ'' نامی کتاب سے یکجا کر دیا(۲)۔

اس کتاب کی ترتیب بھی بہت عمدہ اور نفیس ہے، اس طور پر کہ مصنفؒ ہر کتاب کو ابواب میں تقسیم کرتے ہیں، پھر ہر باب کو فصلوں میں، پھر بعض فصل کو انواع میں اور بعض کو اقسام میں بانٹتے ہیں، اسی طرح بعض دفعہ کتاب کو پہلے اقسام میں بانٹتے ہیں، پھر ہر قسم کو فصل میں تقسیم کرتے ہیں، نیز ہر کتاب کے آخر میں اکثر وبیشتر ''المقطعات'' کے نام سے ایک عنوان قائم کرتے ہیں اور اس میں اس کتاب کے متفرق مسائل کو نقل کرتے ہیں، علامہ ظہیر الدین نے اپنی کتاب کا اختتام کتاب المتفرقات سے کیا ہے، اور اس کو دو نوع میں تقسیم کیا ہے، پہلے کو ''نوع فی المواعظ ومسائلہا'' اور دوسرے کو ''نوع آخر فی ما یسئل من المتشابہات'' عنوان دیا ہے۔

مسائل کے نقل میں اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ جو مسئلہ جس امام سے منسوب ہے، ان کا نام یا کتاب کا نام نقل کر دیتے ہیں، البتہ زیادہ تر مسائل میں مراجع کو نقل نہیں کرتے ہیں، بسا اوقات کسی مسئلہ میں کئی اقوال ہو، تو وہاں ایک قول کو 'ھو الصحیح، ھو الاصح، الفتوی علیہ' جیسے الفاظ کے ذریعہ ترجیح بھی دیتے ہیں، اسی

(۱) الفتاوی الظہیریہ، ص: 1، خ:مکتبہ نور عثمانیہ، ترکی، مخطوطہ نمبر:1995۔
(۲) دیکھئے: المسائل البدریہ المنتخبہ من الفتاوی الظہیریہ کا مقدمہ۔

طرح بعض مسائل میں قرآن وحدیث، اجماع وقیاس، عرف اور استحسان کو بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں، علماء کے آراء کو نقل کرنے میں متقدم ومتاخر کا خیال رکھتے ہیں، فارسی الفاظ کے ذریعہ بھی مسائل کو نقل کیا ہے۔

فتاوی ہندیہ میں اس کتاب کے بہت سے مسائل لئے گئے ہیں، یہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی ہے؛ البتہ عرب کی بعض جامعات (ملک فیصل، ملک سعود وغیرہ) میں اس پہ تحقیقی کام ہوا ہے، اس کتاب کا مخطوطہ دنیا کے متعدد کتب خانے میں دستیاب ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:

1- مکتبہ نور عثمانیہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1995۔
2- مکتبہ ولی الدین جار اللہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: 627۔
3- مکتبہ شہید علی پاشا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1018۔
4- مکتبہ البلدیہ بالاسکندریہ، قاہرہ، مخطوطہ نمبر: 1720ب
5- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1010(۱)۔

الفتاوی العتابیہ (جامع الفقہ)

اس کتاب کا نام جامع الفقہ یا جوامع الفقہ ہے اور فتاوی عتابیہ سے مشہور ہے، اس کے مصنف ابونصر احمد بن محمد بن عمر زاہدی عتابی بخاری (متوفی ۵۸۶ھ) ہیں، آپ اپنے وقت کے بڑے عابد وزاہد اور متبحر عالم دین تھے، علم تفسیر، علم فقہ، علم کلام اور اصول فروع میں یکتائے زمانہ تھے، کثیر تعداد میں طلبہ آپ کی خدمت میں آتے اور کسب فیض کرتے، آپ نے امام محمد کی تین اہم کتابیں الجامع الکبیر، الجامع الصغیر اور الزیادات کی بہت عمدہ اور مفید شرح لکھیں، نیز الجامع الکبیر کی تلخیص بھی کی ہے، اسی طرح آپ نے قرآن مجید کی بھی ایک تفسیر لکھی ہے(۲)۔

فتاوی عتابیہ کو ہر زمانہ میں اہل علم نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس سے استفادہ کیا ہے، آپ نے اپنی اس کتاب میں کثرت سے فقہی جزئیات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے؛ بلکہ بعض جزئیات تو ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں بھی نہیں ملتیں، متاخرین فقہاء احناف میں علامہ عینیؒ، علامہ ابن ہمامؒ، علامہ ابن نجیمؒ، علامہ شلبی، علامہ ابن عابدین شامیؒ وغیرہ نے بکثرت اس سے استفادہ کیا ہے، جس سے اس کتاب کی اہمیت واضح

---

(۱)الفہرس الشامل:56/23-22-22، نیز دیکھئے: خزانة التراث - فہرس مخطوطات:75/ 265-

(۲) کتائب اعلام الاخیار :2/68،الجواهر المضية في طبقات الحنفية :1/ 383الطبقات السنية:2/ 272،الفوائد البهية في تراجم الحنفية ،ص: 36، تاريخ الاسلام للذهبی: 12/814،سلم الوصول الى طبقات الفحول:1/225، تاج التراجم، ص: 103-

ہوتی ہے۔

علامہ عتابیؒ اس کتاب کے مسائل کو فقہی ترتیب پر مرتب کیا ہے، اور ہر کتاب کو ابواب میں تقسیم کیا ہے، پھر ہر باب کو فصلوں میں بانٹا ہے، اور مسائل کو بہت ہی خوبصورتی سے بیان کیا ہے، جس سے کسی بھی مسئلہ کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے: علامہ عتابیؒ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> میں نے اس کتاب میں مشائخ کے ان مسائل کو جمع کیا ہے، جس کی لوگوں کو بکثرت ضرورت پڑتی ہے، اور اس کا نام ''جوامع الفقہ'' رکھا ہے، اس لئے کہ یہ واقعات الکتب، جامعین، زیادات، متقدمین ومتاخرین کے فتاوی کا مجموعہ ہے(۱)۔

فتاوی ہندیہ میں اس کتاب کے سیکڑوں مسائل ماخوذ ہیں، اور اکثر اس کے حوالے ''کذا یاھکذا فی الفتاوی العتابیہ'' سے نقل کئے گئے ہیں، البتہ بعض جگہوں پہ ''کذافی جوامع الفقہ'' بھی کہا گیا ہے، یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی ہے، البتہ جامعہ ملک عبد العزیز سعودیہ میں اس پر تحقیقی کام جاری ہے، اس کتاب کے مخطوطے متعدد مکتبات میں موجود ہیں، جن میں بعض یہ ہیں:

1- مکتبہ عاطف افندی استنبول، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1138۔
2- مکتبہ ولی الدین جاراللہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: 607۔
3- مکتبہ اسعد افندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1066۔
4- مکتبہ مرادملا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 768
5- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 702(۲)۔

شرح مختصر الطحاوی

امام ابوجعفر طحاویؒ کی کتاب ''مختصر الطحاوی'' کو اللہ تعالی نے اہل علم اور فقہاء کے درمیان بڑی مقبولیت سے نوازا، یہی وجہ کہ بڑے بڑے اکابر اور صاحب علم وفضل نے اس کی متعدد شروحات لکھیں، جن میں امام ابوالحسن کرخیؒ، امام ابوبکر جصاصؒ، امام ابونصر الاقطعؒ، امام ابونصر احمد بن منصور مظفریؒ، محمد بن احمد سرخسیؒ، ابوالمعالی محمد بن احمد خجندیؒ، ابونصر احمد بن محمد وبریؒ، شیخ ابوبکر احمد بن علی وراق رازیؒ، علامہ سمرقندیؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں، انہیں شارحین میں ایک نام علی بن محمد بن اسماعیل سمرقندی اسبیجابی (متوفی ۵۳۵ھ) ہیں۔

علامہ اسبیجابیؒ کو اللہ تعالی نے علم وفن کے میدان میں بڑا مقام سے نوازا تھا؛ چنانچہ علامہ سمعانیؒ

---

(۱) دیکھئے: الفتاوی العتابیہ، ص: مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 702۔

(۲) الفہرس الشامل: 56/ 23-22، نیز دیکھئے: خزانۃ التراث-فہرس مخطوطات: 75/ 265۔

ؒ نے آپؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ ماوراءالنہر میں آپؒ کے ہم عصر میں کوئی بھی آپ سے زیادہ مسائل احناف کو یاد کرنے والا، سمجھنے والا اور جاننے والا کوئی نہیں تھا، اللہ تعالی نے آپ کو علم کی نشر واشاعت کے لئے لمبی عمر عطا کیا، عمر میں بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ سمرقند کے ہم عصر علماء پر بھی آپ کو تفوق حاصل تھا، آپ سمرقند کے مفتی تھے، آپ تعلیم وتعلم کے بہت زیادہ حریص تھے(۱)۔

اسبیجابیؒ نام سے مختصر الطحاوی کے دو شارح ہیں، ایک ابونصر احمد بن منصور مظفری اسبیجابی، جنہیں اسبیجابی کبیر کہا جاتا ہے، ان کی وفات ۴۸۰ھ میں ہوئی ہے، دوسرے: علی بن محمد بن اسماعیل سمرقندی اسبیجابی، عام طور سے فقہ حنفی میں شرح الطحاوی کے نام سے جو حوالے آتے ہیں، اس سے دوسرے اسبیجابی (علی بن محمد بن اسماعیل سمرقندی) کی کتاب مراد ہوتی ہے۔

علامہ اسبیجابیؒ اپنی کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں:

> شیخ امام ابوالحسن علی بن ابوبکر نے مختصر الطحاوی کے مسائل کو بہت پھیلایا اور وہ مسائل کے پھیلانے میں امام عصر تھے، نیز انہوں نے ان مسائل کو کسی کتاب میں جمع نہیں کیا، پھر آپ کے بعد شیخ حافظ احمد بن منصور مظفری نے ان مسائل کو بہت ہی زیادہ طوالت کے ساتھ جمع کیا، جنہیں ایک مبتدی طالب علم کیلئے پڑھنا اور سمجھنا دشوار تھا؛ حالانکہ ان مسائل میں بہت سی باتیں مفید اور اہم تھیں؛ لہذا میں نے ان کی کتاب سے مسائل کو چھانٹ کر طوالت اور اختصار سے بچتے ہوئے، خیرالامور اوساطہا پہ عمل کرتے ہوئے عبادات میں ایجاز سے اور معاملات میں تھوڑی تفصیل سے انہی کی ترتیب پر اس کی تلخیص کی (۲)۔

علامہ اسبیجابی کی شرح الطحاوی جسکا پورا نام شرح مختصر الطحاوی ہے، اسکی ترتیب عام فقہی ترتیب پر ہے، وہ بسا اوقات مرکزی کتاب کو ابواب میں تقسیم کرتے ہیں، اور کبھی ابواب میں تقسیم نہیں کرتے ہیں، نیز مختصر الطحاوی کی متن اور اپنی شرح میں کوئی تمیز نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ مطلقا ''قال'' کہہ کر متن کو ذکر کرتے ہیں اور اسی میں شرح بھی کر دیتے ہیں، نیز کبھی متن بالمعنی ذکر کرتے ہیں اور کبھی اصل متن کو نقل کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی وضاحت نہیں کرتے ہیں۔

---

(۱)التحبير فی المعجم الكبير:578/1، نیز دیکھئے: ،الجواهر المضية في طبقات الحنفية :371/1،الفوائد البهية في تراجم الحنفية ،ص: 124،تعليم المتعلم طرق التعلم،ص: 61،بدية العارفين: 697/1،معجم المؤلفين: 183/7،كشف الظنون:1627/2، مفتاح السعادة: 138/2،

(۲)دیکھئے: شرح مختصر الطحاوی، ص:480، مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 702۔

علامہ اسبیجابیؒ نے اپنی اس کتاب کے مسائل کو مختصر الطحاوی کی ترتیب پہ رکھا ہے، اور مسائل کی تفصیل میں اکثر وبیشتر متعدد فقہاء کی آراء کو اور متقدمین اور متاخرین فقہاء کے اقوال کو بھی ذکر کرتے ہیں، نیز فقہاء احناف کی آراء کو ذکر کرنے پہ ہی اکتفا نہیں کرتے؛ بلکہ اکثر وبیشتر امام شافعی، امام مالک، امام ثوری رحمہم اللہ اجمعین وغیرہ کی آراء کو بھی نقل کرتے ہیں۔

امام اسبیجابیؒ نے اپنی اس شرح میں ایک لطیف اسلوب اور منہج یہ اختیار کیا ہے کہ کبھی کسی مسئلہ میں پہلے تطبیق دیتے ہیں اور بعد میں اصل مسئلہ کو نقل کرتے ہیں اور کبھی پہلے اصل مسئلہ کو نقل کرتے ہیں اور پھر اس میں تطبیق دیتے، ہیں نیز مسائل کو نقل کرنے میں کبھی صاحب مسئلہ کے طرف قول کو منسوب کرتے ہیں اور کبھی مسئلہ کے مراجع کی طرف، اسی طرح کبھی مصنف کا نام، کتاب اور باب بھی ذکر کردیتے ہیں، بعض مسائل میں ادلہ شرعیہ کو بھی نقل کرتے ہیں، کبھی حدیث نقل کرکے اس کی سند بھی نقل کردیتے ہیں؛ البتہ حدیث پر حکم کو نقل نہیں کرتے، کہیں کہیں مسئلہ کو سوال وجواب کے شکل میں نقل کرتے ہیں، جس سے مسئلہ کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔

فتاوی ہندیہ میں اس کتاب کے سیکڑوں مسائل آئے ہیں، جسے ''كذا يا هكذا شرح الطحاوى'' سے نقل کیا ہے، یہ کتاب چند ماہ قبل جامعہ ملک عبدالعزیز جدہ کے ایک طالب علم عبداللہ نذیر احمد کی تحقیق سے چار جلدوں میں مکتبہ دارالریاحین سے شائع ہوچکی ہے؛ البتہ اس کتاب کے بعض قلمی نسخے ان مکتبات میں ہیں:

1- مکتبہ عاطف افندی استنبول، ترکی، مخطوطہ نمبر: 896۔
2- مکتبہ قلیج علی پاشا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 484۔
3- مکتبہ ینی جامع، ترکی، مخطوطہ نمبر: 457۔
4- مکتبہ مرادملا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 852-851۔
5- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 803[1]۔

● ● ●

[1] الفہرس الشامل: 84/25-24 نیز دیکھئے: خزانۃ التراث-فہرس مخطوطات: 56/559۔

آسمان فقہ کا درخشندہ تارہ

امام رضی الدین سرخسیؒ (پہلی قسط)

عبید اختر رحمانی
(نگراں شعبہ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی)

ایران اور ترکمانستان کی سرحد پر ایک شہر واقع ہے جس کا نام سرخس ہے، علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت بالخصوص حدیث کے باب میں اس علاقہ کا نمایاں اور گراں قدر حصہ ہے، بالخصوص حدیث کے باب میں اس علاقہ کے محدثین کی خدمات نمایاں ہیں - (دیکھئے سمعانی کی الانساب میں سرخسی کی نسبت پر بحث)

علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ فقہ حنفی میں بھی اس علاقہ کے فقہاء کی خدمات بہت نمایاں ہیں، شمس الائمہ سرخسی (وفات ۴۸۳ھ) کے نام سے فقہ حنفی کا ہر طالب علم واقف ہے، جن کی گراں قدر تصنیف مبسوط کے بار احسان سے سبھی کی گردن ان کے علم وفضل کے آگے جھکی ہوئی ہیں، اسی سرخس کی سرزمین سے شمس الائمہ کی وفات کے تقریباً بیس پچیس سال بعد ایک اور شخصیت اٹھی جس نے فقہ حنفی کو اپنی گراں تصنیفات سے مالا مال کیا اور اسی شخصیت کے حالات زندگی اور کمالات علمی کا تذکرہ آج کی اس تحریر کا مقصد ہے۔

حالات پر گمنامی کا پردہ:

فقہ حنفی کے دیگر نامور فقہاء کی طرح آپ کے بیشتر حالات وصفات پر گمنامی کا پردہ پڑا ہے، اب چاہے اس میں احناف کی تراجم وسوانح سے بے توجہی کا دخل ہو یا پھر تاتاریوں کے ہاتھوں حنفیوں کے علمی تراث کا ضیاع، وجہ چاہے کچھ بھی ہو، ہمارے بیشتر فقہاء کرام کے حالات وصفات پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے، اور اگر کچھ مذکور بھی ہے تو اتنا کم کہ اس سے کوئی تشنگی دور نہیں ہوتی، اب جو کچھ بھی ہے، تنکے تنکے جمع کرکے اور مختلف کتابوں کی ورق گردانی سے تھوڑے بہت حالات جو کچھ بہم پہنچے ہیں، وہ نذر قارئین ہیں۔

خاندان اور نام ونسب:

آپ کا نام محمد، والد اور دادا کا نام بھی محمد ہے، گویا اس طرح تین نسلوں میں یکے بعد دیگر سبھی کا یہی بابرکت نام رہا ہے، آپ کے والد کا لقب تاج الدین ہے، وہ اپنے عہد کے بڑے فقیہ تھے، ان کی بعض آراء فقہ حنفی کی بعض کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، قنیہ میں نذر کے ایک مسئلہ میں صاحب قنیہ نے آپ کی رائے ذکر کی ہے، آپ کا لقب برہان الاسلام اور رضی الدین ہے جس سے آپ کی عظمت شان ظاہر ہوتی ہے۔ اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ (جواہر المضیۃ، ۲/۱۲۸)

آپ کی ولادت کی تاریخ سے تراجم وسوانح کی کتابیں خالی ہیں، کہیں بھی کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا، لیکن آپ کے بعض اساتذہ کرام سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی ولادت پانچویں صدی کے آخر یا چھٹی صدی کی ابتدا میں ہوئی ہے، اس کا تفصیلی ذکر آپ کے انتقال کے موقع پر آئے گا۔

تعلیم وتربیت اور اساتذہ کرام:

آپ کے والد بڑے فقیہ تھے نذر کے ایک مسئلہ میں ان کے اختلاف کا ذکر صاحب قنیہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے، جس سے ان کی جلالت شان واضح ہوتی ہے۔

> وتاج الدّين هَذَا ذكره صَاحب الْقنية فى مسئلة من نذر بالسنن فَأتى الْمَنْذُور بِهِ فَهُوَ السّنة ثمَّ قَالَ وَقَالَ تَاج الدّين أَبُو صَاحب الْمُحِيط لَا يكون إتيانا بِالسنةِ رَحِمهم الله تَعَالَى (الجواهر المضية في طبقات الحنفية (118/2)

لہذا یہ طبعی بات ہے کہ آپ کے پہلے استاذ آپ کے والد محترم ہی رہے ہوں گے، انہوں نے ہی آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت کی ہوگی اور انہی سے فقہ کی ابتدائی اور متوسط کتابیں آپ نے پڑھی ہوں گی، چونکہ وہ بڑے فقیہ تھے، اس لئے فقہ کی جانب آپ کا میلان طبعی اور والد کے اثرات کا ہی نتیجہ ہوگا، اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس عہد میں فقہ ہی لوگوں کی غالب دلچسپی کا میدان تھا، بڑے بڑے فقہاء کے نام اور کام سے سرخس کا گونج رہا تھا، شمس الائمہ سرخسی کے انتقال کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا اور امام حسام الدین شہیدؒ کے علمی کمالات کا ہر جگہ ذکر تھا لہذا ایسے میں فقہ کی جانب توجہ ہونا اور اس کو اپنے آئندہ کی زندگی کا محور ومقصد بنانا فطری اور طبعی بات ہے، والد کے علاوہ آپ نے جن اساتذہ سے کسب فیض کیا ہے، ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱)　محمد بن احمد ابوبکر سمرقندی صاحب تحفۃ الفقہاء:

آپ کا نام محمد، اور کنیت ابوبکر ہے، فقہاء احناف میں آپ کا بڑا مرتبہ ہے، آپ نے اپنے دور کے مشہور حنفی فقہاء ابوالمعین میمون المکحولی اور صدر الاسلام ابوالیسر بزدوری سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور فقہ میں بلند مقام کے حامل ہوئے، آپ کی تصانیف فقہ میں کئی ہیں لیکن سب سے مشہور اور آپ کے نام کو زندہ رکھنے والی تحفۃ الفقہاء ہے، جس کے متن کو بنیاد بنا کر اس کی شرح کرتے ہوئے آپ کے داماد اور مشہور حنفی فقیہ علاء الدین ابوبکر کاسانی نے البدائع والصنائع جیسی گراں مایہ شرح سے فقہ حنفی کو مالا مال کیا، آپ کے شاگردوں میں امام ضیاء الدین محمد بن حسین نمایاں ہیں جو صاحب ہدایہ کے بھی استاذ ہیں، آپ کی ایک بیٹی تھی جو علاوہ حسن و جمال کے علم وفضل میں بھی ممتاز تھی اور آپ کی تصنیف تحفۃ الفقہا کی حافظہ تھی، فقہ میں آپ کی صاجزادی کا پایہ اتنا بلند تھا کہ اپنے عالی مقام فقیہ شوہر کو علمی غلطیوں پر ٹوکا کرتی تھیں، صاحب بدائع سے شادی سے قبل معمول تھا کہ جو بھی فتوی صاحب تحفۃ الفقہا کے پاس آتا تو اس پر آپ کے دستخط کے علاوہ صاجزادی کے بھی دستخط ہوتے، شادی کے بعد معمول یہ تھا کہ کسی بھی فتوی پر صاحب تحفۃ الفقہاء، صاحب بدائع اور صاجزادی کے دستخط ہوا کرتے تھے۔(الفوائد البھیہ ،الجواہر المضیۃ)

(۲)　امام حسام الدین شہیدؒ:

آپ کا نام عمر، والد کا نام عبدالعزیز اور دادا کا نام عمر اور دادا کی کنیت ابومازہ ہے، آپ کی کنیت ابومحمد ہے، آپ کی ولادت سنہ ۴۸۳ھ میں ماہ صفر میں ہوئی، آپ کے والد جلیل القدر فقیہ تھے، آپ نے ان سے اور بخاری جو اس وقت علماء وفضلا سے معمور تھا، ان سے تحصیل علم کیا اور جلد ہی آپ کی علمی شہرت دور دور تک پہنچ گئی، آپ کے شاگردوں کی بڑی تعداد ہے، جس میں صاحب ہدایہ سے لے کر امام رضی الدین سرخسی اور صاحب محیط برہانی اور دیگر علماء وفضلا شامل ہیں، آپ ان علماء ربانین میں سے تھے جو دین اسلام کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ملکی سرحدوں کی حفاظت یعنی جہاد کیلئے بھی ہمہ وقت کمر بستہ رہتے ہیں، کافر ترکوں سے جہاد کرتے ہوئے آپ کی شہادت ہوئی، یہ جنگ چونکہ سنہ ۵۳۶ ہجری میں ہوئی، اس لیے آپ کی تاریخ وفات بھی یہی ہے، اس طرح آپ کی کل عمر چون پچپن سال ہوتی ہے، اس مختصر مدت میں آپ نے جو علمی کارنامے انجام دیئے، وہ نہایت حیرت انگیز ہیں، آپ کی تصانیف میں سے شرح ادب القضا للخصاف، شرح الجامع الصغیر، الفتاوی الکبریٰ، الفتاوی الصغریٰ، عمدۃ الفتاویٰ، عمدۃ المفتی والمستفتی وغیرہ مشہور ہیں۔(الفوائد البھیہ ،الجواہر المضیۃ)

امام حسام الدین صدر شہیدؒ کو دنیا میں جو شہرت ملی اور مقام حاصل ہوا، اس کے پیچھے آپ کے والد کے

حسن نیت کا بڑا دخل ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

آپ کے والد محترم برہان الائمۃ عبدالعزیز بن عمر نے اپنے دونوں بیٹے، صدرالشہید اور صدرالسعید کے اسباق زوال سے تھوڑا پہلے رکھا تھا، انہوں نے ایک مرتبہ آپ سے عرض کیا کہ اس وقت ہماری طبیعت تھک جاتی ہیں، پڑھنے میں دلچسپی اور نشاط باقی نہیں رہتا، سبق کسی دوسرے وقت کر دیا جائے، انہوں نے جواب دیا کہ یہ طلبہ دور دراز سے آئے ہیں، یہ پردیسی ہیں، ان کا حق ہے کہ ان کو پہلے سبق پڑھایا جائے اور تم کو بعد میں۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

طلبہ پر ان کی شفقت کا ثمرہ ہی تھا کہ آپ کے دونوں بیٹے آسمان علم پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے اور اپنے ہم عصروں سے علم وفضل میں آگے بڑھ گئے۔ (تعلیم المتعلم ص:۱۱۹)

امام سرخسی اور ان کے معاصرین:

امام سرخسی کو جس طرح اپنے عہد کے نامور فقہاء احناف سے تحصیل علم کا موقع ملا اور ان کی فقہی تربیت ہوئی، اسی طرح آپ کے معاصرین بھی بڑے پائے کے اور بلند مقام حنفی فقہا ہیں، ذیل میں دو تین حضرات کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) امام علی بن ابوبکر مرغینانی:

آپ کی ولادت سنہ ۱۱ رجب ۵۱۱ ہجری میں ہوئی، آپ نے اپنے عہد کے نامور اساتذہ جیسے نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد بن احمد النسفی، صدرالشہید حسام الدین عمر بن عبدالعزیز بن عمر مازہ اور ابوعمر عثمان بن علی وغیرہم سے حاصل کیا، علوم اسلامی بالخصوص حدیث اور فقہ میں آپ کا مقام نہایت بلند ہے، ہدایہ کی تصنیف میں آپ کو کامل تیرہ سال لگے، اس کتاب نے نہ صرف فقہ حنفی میں بلکہ دیگر مذاہب کی کتابوں کے درمیان بھی عقل ونقل سے استدلال کے معاملے میں نمایاں مقام حاصل کیا، آپ کی فقاہت اور علو مقام کا اعتراف آپ کے معاصرین اور بعد والوں نے کیا ہے، آپ کا انتقال ۱۴ ذوالحجہ ۵۹۳ھ میں ہوا، آپ کی تالیفات میں درج ذیل کتابیں نمایاں ہیں:

- مجموع مختارات النوازل۔
- التجنيس والمزيد۔

- کتاب فی الفرائض۔
- المنتقی۔
- بدایة المبتدی۔
- کفایة المنتہی۔
- مناسک الحج۔
- نشر المذہب۔

(۲) امام ابوبکر بن مسعود کاسانیؒ:

آپ کی تاریخ ولادت سے تراجم وسوانح کی کتابیں خالی ہیں، آپ نے بدوشعور سے علم کی تحصیل شروع کردی، فقہ میں آپ کے خاص استاذ شیخ علاء الدین سمرقندی صاحب تحفة الفقہاء ہیں، ان سے ہی آپ نے فقہ میں اصول وفروع میں کمال حاصل کیا، ان کے شوق علم اور فقہ میں کمال کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنی بیٹی سے جو حسن وجمال، ذہانت وفطانت اور علم وداب میں اپنی مثال آپ تھی، اس سے آپ کی شادی کردی، کہا جاتا ہے کہ اس شادی کا سبب اپنے شیخ کی کتاب تحفہ کی شرح تھی جو بدائع صنائع کے نام سے معروف ہے، بادشاہ اورامراء آپ کا احترام کرتے تھے، ۱۰رجب سنہ ۵۸۷ھ کو آپ کا انتقال ہوا، دم واپسیں کے وقت آپ کی زبان پر یہ آیت تھی:

{يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الآخِرَةِ[إبراهيم:27]

(۳) برہان الدین محمود بن احمد الصدر السعید صاحب محیط برہانی:

آپ کی ولادت سنہ ۵۵۱ھ (۱) میں ہوئی، آپ نے اپنے والد صدر سعید اور چچا حسام الدین صدر شہید سے علم حاصل کیا اور جلد ہی علوم اسلامیہ بالخصوص فقہ میں کمال حاصل کرلیا، آپ کی تصانیف میں محیط برہانی کو فقہ حنفی کے ذخیرہ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ محیط برہانی اور محیط رضوی چونکہ دونوں کا موضوع، نام، اور ضخامت تقریباً

---

(۱) فوائد بہیہ میں شیخ عبدالحی فرنگی محلی نے یہی لکھا ہے، لیکن تاریخی اعتبار سے یہ درست نظر نہیں آتا کیونکہ امام حسام الدین صدر شہید کا انتقال ۵۳۷ یا ۵۳۶ھ میں ہوگیا تھا، جب کہ صاحب محیط برہانی کی ولادت ہی ۵۵۱ھ میں ہوئی، دونوں کی ولادت اور وفات کے درمیان تقریبا ۱۴ سال سے زائد کا وقفہ ہے، ایسے میں جب تک اس بات کی کوئی صریح وضاحت نہ مل جائے کہ آپ نے امام حسام الدین سے علم حاصل کیا تھا تب تک اس کو درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

برابر ہے،اس لیے بعض تذکرہ نگاروں پر مشتبہ بھی ہوا ہے،اس کی بہتر وضاحت حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے فوائد بہیہ میں امام رضی الدین سرخسی کے ترجمہ میں کی ہے۔

زبان میں لکنت اور مخالفین کی ریشہ دوانیاں

حالات زندگی پر تاریکی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے،شادی،اولاد،شاگرد،اخلاق وکردار کے بارے میں کہیں تفصیل نہیں ملتی،بس کہیں کہیں تراجم وسوانح کے روزن سے چھن چھن کر روشنی آتی ہے تو کچھ باتیں پتہ چلتی ہیں اور اسی سے آپ کے اخلاق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

وہ زمانہ سیاسی طور پر نہایت پرآشوب تھا،شام میں اس وقت نورالدین زندگی کی حکومت تھی جو مسلکاً حنفی تھے اور ہر مسلک ومشرب کے علماء کی تعظیم وتکریم کرتا تھے،ممکن ہے کہ جب نورالدین زندگی کی نیک سیرت اور علماء کے ساتھ حسن سلوک کا شہرہ ہوا تو آپ نے بھی حلب کا رخ کیا،آپ کے حلب پہنچنے کے بعد نورالدین زندگی نے آپ کی صلاحیتوں کے پیش نظر مدرسہ حلاویہ اور نوریہ میں مدرس اعلیٰ مقرر کردیا،یہ تقرری کچھ جاہ پسند علماء کو پسند نہ آئی اور انہوں نے آپ کے خلاف نورالدین زندگی کے کان بھرنے شروع کردیے اور اس سلسلے میں آپ کی خلقی کمزوری یعنی زبان میں لکنت کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا کہ آپ ٹھیک سے درس نہیں دے سکتے،الفاظ میں تصحیف وتحریف کرتے ہیں،جبائر کو خبائر کہتے ہیں،یہ مخالفین کا مبالغہ اور غلو تھا،اتنی بات تو حقیقت تھی کہ آپ کی زبان میں لکنت تھی لیکن اس کی وجہ سے تصحیف اور تحریف کی بات غلط تھی،تقریباً تمام ہی سوانح نگاروں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ آپ کی زبان میں لکنت تھی (دیکھیے فوائد بہیہ،الجواہر المضیہ ،اثمار الجنیۃ ،تاج التراجم وغیر ذلک ترجمہ رضی الدین سرخسی)

اسی لکنت کی وجہ سے آپ کے مخالفین اور معاندین کو موقع ملا کہ وہ بات کو بڑھا چڑھا کر اور سوئی کو بلم بھالا بنا کر پیش کریں اور چونکہ امراء اور بڑے عہدوں پر فائز لوگوں کی یہ عام کمزوری ہوتی ہے کہ وہ آنکھوں دیکھی سے زیادہ کانوں سنی پر اعتماد کرتے ہیں،اسی لیے آپ کے مخالفین کی ریشہ دوانیاں کامیاب ہوگئیں؛ کیونکہ ایک تو فطری طور پر آپ مین لکنت تھی ،دوسرے معاندین کی چرب زبانی ،ان دونوں نے مل کر آپ کے خلاف دربارشاہی میں ماحول تیار کیا۔

نورالدین زندگی نیک دل اور نیک سیرت بادشاہ تھا مگر اس کے پاس نہ اتنی فرصت تھی اور نہ اس جانب اتنی توجہ کہ وہ بذات خود اس معاملہ میں دلچسپی لیتا اور صحیح غلط میں تمیز کرتا،اتفاق یہ ہوا کہ اسی زمانے میں مشہور حنفی

فقیہ امام کاسانی بھی حلب آئے، نورالدین زنگی نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ان کو مدرسہ حلاویہ کا مدرس اعلیٰ مقرر کردیا، نورالدین زندگی نے ایک جانب جہاں آپ کے مخالف علماء کی بات تسلیم کرتے ہوئے آپ کو مدرسہ حلاویہ کی تدریس سے معزول کردیا، وہیں دوسری جانب آپ کے علم وفضل کا خیال کرتے ہوئے پایہ تخت دمشق کے مدرسہ حاتونیہ میں تدریس کی ذمہ داری سپرد کردی، آپ نے مخالفین کی ریشہ دوانیوں کو خوش دلی سے قبول کیا کہ مقصد تو درس وتدریس اور تصنیف وتالیف اور علم کی نشر واشاعت ہے، اب اس سے کیا غرض کہ میکدہ ہو یا خانقاہ، مدرسہ حاتونیہ میں تدریس کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے ہی آپ کا انتقال ہوا۔

علم وفضل پر شک کا اظہار:

آپ کے مخالفین نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ آپ کی زبان کی لکنت کی وجہ سے آپ کے مقام ومرتبہ پر داغ لگانے کی کوشش کی بلکہ آپ کے علم وفضل پر بھی انہوں نے نکتہ چینی کی اور علمی دنیا کے سب سے سنگین الزام سرقہ کا اتہام آپ پر لگایا، اور بتایا کہ محیط آپ کی تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ تو آپ کے استاذ حسام الدین شہید کی تصنیف ہے اور آپ نے کسی طرح سے اس کو حاصل کرکے اپنی جانب منسوب کرلیا ہے:

فنُسِب إلی غیر ما اشتهر به وإنه لم یصنف المحیط لقصورہ فی الفقه عن ذلك، وأنه تصنیف شیخه، فادعاہ لنفسه(تاج التراجم لابن قطلوبغا (ص249)

یہ اتہام کئی وجوہ سے بے بنیاد ثابت ہوتی ہے، **پہلا:** مخالفین کے اس افتراء کو اہل علم نے کبھی لائق اعتنا نہیں گردانا اور تمام تذکرہ نگاروں نے آپ کو ہی محیط کا مصنف بتایا ہے، **دوسرے:** یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ محیط رضوی جیسی ضخیم کتاب اگر حسام الدین شہید کی ہوتی تو تمام تذکرہ نگار اس کا ذکر کرتے، لیکن حسام الدین شہید کے ترجمہ میں کہیں بھی اس کا ذکر موجود نہیں ہے، **تیسرے:** مصنف کا اسلوب داخلی طور پر سب سے بڑی شہادت ہوتی ہے، اس کتاب کا اسلوب واضح طور پر حسام الدین شہید کی تصانیف سے الگ ہے، حسام الدین شہیدؒ کی عبارت بڑی صاف، واضح اور سلیس ورواں ہوتی ہے، جب کہ محیط رضوی میں نسبتاً مشکل اسلوب ہے، اس کے انداز بیان میں تعقید اور مشکل پسندی ہے، **چوتھے:** محیط رضوی کے اب جتنے بھی نسخے دستیاب ہوئے ہیں، سب پر آپ ہی کا نام ہے، کہیں بھی حسام الدین شہیدؒ کا نام نہیں ہے؛ اس لیے یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ مخالفین کا یہ افتراء محض الزام تراشی تھی جس کے پیچھے حقیقت اور واقعیت دور دور تک نہیں تھی۔

وسعت ظرف

موت کا آخری لمحہ آیا تو انہوں نے اپنی کتاب محیط کا غلاف کھولا تو اس میں تقریباً چھ سو دینار تھے جو اس زمانے کی اور آج بھی ایک بڑی رقم ہے، آپ نے وصیت کی کہ اس کو مدرسہ حاتونیہ کے دیگر مدرس فقہاء پر خرچ کر دیا جائے، اس سے آپ کے عالی حوصلہ اور سخاوت وکرم کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ خدا کا انصاف ہے کہ جن لوگوں نے آپ کی مخالفت میں ریشہ دوانیاں کیں، آج ان کا نام بھی تاریخ وتذکرہ میں زندہ ہے تو محض اس بنیاد پر کہ انہوں نے آپ کے خلاف سازشیں کی تھیں، ورنہ ان کا اپنا نام اور کام گمنام ہو چکا ہے اور تاریخ نے ان کو بھلا دیا ہے، اور یہ درحقیقت خدا کا قانون ہے کہ ماینفع الناس باقی رہتا ہے، اور زبدو جھاگ تھوڑے دن کے بعد فنا سے ہمکنار ہو جاتا ہے، اور تاریخ بھی اس کی گواہی دیتی ہے کہ جن لوگوں نے اپنا وقت مثبت کاموں میں اور علم وتحقیق میں صرف کیا، علم کی دنیا میں ان کا نام زندہ جاوید ہوگیا اور جن لوگوں نے بلاوجہ یا مخالفانہ جذبات کے تحت مخالفت پر کمر باندھی، ان کا نام فنا ہوگیا، زندگی میں جس قدر ان کی شان تھی، موت کے بعد وہ اتنے ہی گمنام ہو گئے اور اگر کہیں نام بھی آتا ہے تو محض کسی صاحب علم وتحقیق کی مخالفت اور دشمنی کے ذیل میں، اس سے زیادہ کسی کے لیے ذلت کی بات اور کیا ہوگی کہ زندگی بھر کوئی جس کے نام کو مٹانا چاہے، بعد میں خود اس کا نام اسی کے حوالہ سے یاد کیا جائے، اور یہیں سے رسول اللہ ﷺ کی عظمت شان اور ابوجہل کی ذلت وخواری معلوم ہوتی ہے کہ اب اس کا نام محض آپ ﷺ کی مخالفت کے ضمن میں ہی زندہ ہے۔

وفات:

آپ کی وفات کب ہوئی، اس بارے میں سوانح نگاروں میں خاصا اختلاف ہے، متعدد سوانح نگاروں نے آپ کی تاریخ وفات ۵۴۴ھ بتائی ہے، تاریخ وفات پر مشہور سوانح نگار شیخ زرکلی نے عمدہ بحث کی ہے، اس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

> عام طور پر سوانحی مصادر نے آپ (رضی الدین سرخسی) کی تاریخ وفات ۵۴۴ء بیان کی ہے لیکن مجھے جواہر المضیۃ کے ایک بیان نے اس پر یقین کرنے سے روک دیا، جواہر المضیہ میں مذکور ہے کہ حلب کے فقہاء آپ سے تعصب کرنے لگے اور اس میں سب سے پیش پیش افتخار الدین عبدالمطلب بن الفضل ہاشمی متوفی ۶۱۶ھ تھے، متعدد مصادر سے رجوع کے بعد معلوم ہوا کہ افتخار الدین کی سنہ ولادت ۵۳۹ ہجری ہے اور یہ بات قطعاً معقول نہیں ہے کہ محض پانچ

چھ سال کی عمر میں افتخار الدین کو یہ مقام ومرتبہ حاصل ہو جائے کہ وہ آپ کی مخالفت میں کمر بستہ ہو جائیں، دوسرے محیط رضوی کے بعض مخطوطات پر یہ عبارت موجود ہے کہ آپ پر یہ کتاب سنہ ۵۶۳ھ یا اس کے بعد پڑھی گئی، اور میرے بعض دوستوں کو حلب کی تاریخ پر مبنی کتاب نہر الذھب فی تاریخ حلب (۲/ ۲۲۲) میں صراحتاً آپ کی تاریخ وفات کا ذکر ملا، جس میں لکھا ہے، آپ کی وفات بروز جمعہ، ماہ رجب میں سنہ ۵۷۱ ہجری میں ہوئی، اس تاریخ سے سارے اشکالات دور ہو جاتے ہیں اور کہیں کوئی اعتراض واشکال کا موقع باقی نہیں رہتا۔ (الأعلام للزرکلی (25/7)

شاگرد وتلامذہ:

یہ بڑے حیرت کی بات ہے کہ اس علم وفضل کے ساتھ اور پوری عمر تدریس میں بسر کرنے کے باوجود آپ کے شاگردوں کا کوئی ذکر کہیں نہیں ملتا، کتب تراجم وسوانح اس سے خالی ہیں، جس نے عمر عزیز کی دوتہائی سے زیادہ تدریس میں صرف کیا ہو، اس کے کسی شاگرد کا کتب تراجم وتذکرہ میں ذکر نہ ہونا بڑی حیرت کی بات ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

مصادر الدراسات الاسلامیہ عرب سے ایک اہم کتاب شائع ہوئی ہے جس میں اسلامیات کے تعلق سے اہم مصنفین اور ان کی تصنیفات کا تعارف پیش کیا گیا ہے، اس کتاب کے پانچویں جزء میں عجیب وغریب خلط ملط ہوا ہے، مشہور محدث رضی نیشاپوری کے ذکر میں امام رضی الدین سرخسی کے ذکر کو خلط ملط کر دیا ہے اور وہیں ان کے چار شاگردوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے شاگردوں کا ذکر کہیں بھی نہیں ملتا (دیکھئے مصادر دراسات اسلامیہ، جزء خامس، صفحہ: ۲۹۴)

علمی مقام ومرتبہ:

تمام تذکرہ نگاروں نے فقہ میں آپ کے علو شان اور بلند مقام کا اعتراف کیا ہے، حنفی فقہاء کے مشہور سوانح نگار حافظ عبد القادر القرشی آپ کو ''علامہ، امام کبیر'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں (الجواہر المضیۃ: ۲/ ۱۲۸) تو مولانا عبد الحی فرنگی محلی آپ کو ''امام کبیر'' اور ''علوم نقلیہ وعقلیہ'' کا جامع قرار دیتے ہیں (الفوائد البہیہ: ۱۸۸) صاحب اعلام علامہ زرکلی آپ کو ''مسلک احناف کے بڑے فقیہ'' سے یاد کرتے ہیں، مکتبہ ولی الدین ترکی کا محیط کا جو مخطوطہ

ہے،اس مخطوطہ کی پشت پر آپ کے بارے میں یہ کلمات تعریف وتوصیف لکھے ہوئے ہیں :

الشیخ العلامة، وحبرالبحر ،المدقق، الفهامة، وحیددهره وفرید عصره، قدوة الافاضل،عمدةالاماثل

اور آپ کے بعد فقہ حنفی میں لکھی گئی تقریبا تمام کتابوں میں آپ کی تصنیفات سے استفادہ کیا گیاہے جو آپ کے علمی مقام ومرتبہ پر شاہد عدل ہے۔

تصانیف :

آپ کی زندگی اور علم وفضل کا خاص عنوان فقہ واحکام شرعی سے عبارت ہے، جن اساتذہ سے آپ نے علم حاصل کیا،ان میں بھی سبھی فقہ کے ماہر تھے،آپ کی تصانیف جن کے نام ہم تک پہنچے ہیں،سبھی فقہ کے موضوع پر ہی ہیں،ذیل میں ان کے نام لکھے جاتے ہیں:

(۱) المحیط الرضوی، اسی کتاب کو المحیط السرخسی سے بھی تعبیر کیاجا تاہے،اس پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے،اس کے علاوہ آپ نے اسی کتاب کی دس تلخص دس جلدوں میں بھی کی، چار جلدوں میں بھی کی اور دو جلدوں میں بھی۔

(۲) الطریقة الرضویہ

(۳) الوسیط

(۴) الوجیز

المحیط الرضوی:

محیط نام سے فقہ حنفی میں تین کتابیں ہیں،

(۱) امام ابوعلی حسین بن یحییٰ الزندوستی کی محیط

(۲) امام محمود بن تاج الدین صدرالشریعہ کی محیط

(۳) امام رضی الدین محمد سرخسی کی محیط

(۴) امام سرخسی صاحب مبسوط کی جانب بھی کشف الظنون میں محیط کو منسوب کیا گیاہے،لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ صاحب کشف الظنون کا وہم ہے، کیونکہ ان کے علاوہ کسی اور نے بھی امام سرخسی صاحب مبسوط کی جانب محیط نام کسی فقہی تصنیف کو منسوب نہیں کیا ہے،ہوسکتا ہے کہ سبقت قلم کی وجہ سے چونکہ دونوں سرخس کے رہنے والے

تھے، محیط کو امام رضی الدین سرخسی کے بجائے امام ابوبکر سرخسی کی جانب منسوب کر دیا ہو۔

لیکن محیط نام کی جن دو کتابوں کی علمی دنیا میں شہرت ہوئی، وہ امام رضی الدین سرخسی اور امام برہان الدین محمود کی محیط ہے، دونوں ہم عصر ہیں، دونوں ماوراء النہر کے رہنے والے ہیں، دونوں کے اساتذہ میں بھی اشتراک ہے، دونوں کا موضوع بھی ایک ہے یعنی فقہ حنفی ، اور دونوں کتابیں بڑی ضخیم ہیں، اس لحاظ سے دونوں میں بڑا اشتباہ ہوا ہے، مصنف کے لقب کی نسبت سے ایک کو رضی الدین کی نسبت سے محیط رضوی یا علاقہ کی نسبت سے محیط سرخسی کہا گیا اور دوسرے کو مصنف کے لقب برہان الدین کی نسبت سے محیط برہانی کہا گیا۔

لیکن ان دونوں کتابوں میں علماء اعلام کو بڑا اشتباہ ہوا ہے، کسی نے محیط رضوی کو محیط برہانی بنادیا اور کسی نے محیط برہانی کو محیط رضوی سے تعبیر کر دیا، اس بارے میں علماء کی تصنیفات میں متضاد اور برعکس عبارتیں موجود ہیں، ہے، اس کا ذکر کرنے کے بعد حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھتے ہیں:

قلت: لقد أوحشتني هذه العبارات المختلفة من وجوه أحدها أنه يعلم من إفادة صاحب الجواهر المضية وصاحب المدينة وصاحب القاموس أن المحيط الكبير الذى هو نحو من أربعين مجلداً للسرخسي وابن الحنائي يقول أن المحيط البرهاني لصاحب الذخيرة محمود بن أخي الصدر الشهيد وثانيها أنه يعلم من كلامهم أن لرضي الدين أربع محيطات ومن المعلوم أن لصاحب الذخيرة أيضاً محيطاً مشهوراً بالمحيط البرهاني فيكون هو محيطاً خامساً وإن الحنائي يقول أن له ثلاث محيطات والرابع هو المحيط البرهاني وثالثها أنه يعلم من كلام ابن أمير حاج أن المفقود في ديار الشام هو المحيط البرهاني وكلام الفيروزآبادي صاحب القاموس يحكم بأن المفقود هو المحيط الكبير الرضوي ورابعها أنه ذكر القطب المكي ظناً أن صاحب المحيط البرهاني متأخر قليلا عن صاحب المحيط الرضوي مع أنه ذكر هو وغيره أن صاحب المحيط الرضوي تلميذ للصدر الشهيد ومن المعلوم أن صاحب المحيط البرهاني أيضاً تلميذ لعمه الصدر الشهيد وقد ذكر في ديباجة الذخيرة الذى هو ملخص المحيط حسام الدين بلفظ الأستاذ فيلزم أن يكون متعاصرين لا متقدماً ومتأخراً

إلا أن يقال مراده تأخر وفاة صاحب المحيط البرهاني وخامسها أن مفاد كلام جماعة أن النسخة الكبرى من محيطات السرخسي نحو أربعين مجلدًا ومفاد كلام ابن الحنائي أنها المحيط البرهاني والنسخة الكبرى من محيطات السرخسي نحو عشر مجلدات وسادسها أن مفاد كلام ابن الحنائي أن المحيط إذا أطلق يراد به النسخة الكبرى من محيطات السرخسي غالبًا وهو خلاف ما صرح به ابن أمير حاج في حلية المحلي شرح منية المصلي من أن المراد به حيث أطلق في الكتب المتداولة المحيط البرهاني(الفوائد البهية في تراجم الحنفية،ص:191)

میں (عبدالحی) کہتا ہوں کہ ان مختلف ومتضاد عبارات نے مجھے کئی وجوہ سے پریشانی میں ڈال دیا، پہلی بات یہ کہ جواہر مضیہ، مدینہ اور قاموس کے مصنف کی عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ محیط کبیر جو چالیس جلدوں میں ہے، وہ امام رضی الدین سرخسی کی ہے، جب کہ ابن حنائی یہ کہتے ہیں کہ وہ چالیس جلدوں پر مشتمل محیط کبیر ذخیرہ کے مصنف محمود کی ہے جو صدر شہید کے برادرزادہ ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ ان علماء کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام رضی الدین سرخسی کی چار محیط ہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ ذخیرہ کے مصنف کی بھی ایک محیط نام کی کتاب ہے تو اس طرح محیط کے نام سے کل پانچ کتابیں ہوجاتی ہیں، جب کہ ابن حنائی کے کلام سے واضح ہوتا ہے کہ امام رضی الدین سرخسی کی تین محیط نام کی کتاب ہے اور چوتھی محیط برہانی ہے، تیسری بات یہ ہے کہ ابن امیر حاج کی عبارت بتارہی ہے کہ شام کے علاقوں میں محیط برہانی مفقود ہے اور قاموس کے مصنف فیروز آبادی کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ مفقود محیط رضوی ہے، چوتھی بات یہ ہے کہ قطب مکی کا خیال ہے کہ محیط برہانی کے مصنف زمانی اعتبار سے محیط رضوی کے مصنف کے بعد کے ہیں، حالانکہ وہ اور دیگر علماء نے یہ بات صاف صاف ذکر کی ہے کہ محیط رضوی کے مصنف امام صدر شہید کے شاگرد ہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ محیط برہانی کے مصنف بھی صدر شہید کے شاگرد ہیں اور ذخیرہ جو محیط برہانی کا خلاصہ ہے، اس کے دیباچہ میں انہوں نے امام حسام الدین کو استاذ کے لفظ سے یاد کیا ہے (اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان کے شاگرد

ہیں) تو اس سے نتیجہ واضح ہے کہ دونوں معاصر ہیں زمانی اعتبار سے متقدم اور متاخر نہیں ہیں، ہاں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ محیط برہانی کے مصنف کا انتقال بعد میں ہوا، چوتھی بات یہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ محیط کبیر امام سرخسی کی تصنیف ہے جب کہ ابن حنائی کہتے ہیں کہ وہ محیط برہانی ہے (مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے یہ بات مکرر ذکر کردی ہے) چھٹی بات یہ ہے کہ ابن حنائی کے کلام کا مفاد یہ ہے کہ محیط جب مطلق بولا جائے تو اس سے امام سرخسی کا محیط کبیر مراد ہوگا، جب کہ ابن امیر الحاج نے منیۃ المصلی کی شرح حلیۃ المحلی میں یہ بات کہی ہے کہ جب مطلق محیط استعمال کیا جائے تو اس سے محیط برہانی مراد ہوگی۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے علماء کی تحریروں میں جو اختلاف ہے، اس کو بہترین طریقے سے اختصار کے ساتھ نقل کر دیا ہے، لیکن اس کے آگے انہوں نے کچھ نہیں لکھا، جس سے واضح ہوتا کہ ان کا رجحان کس جانب ہے، ان کے نزدیک صحیح بات کس کی ہے؟ بنیادی بات یہ ہے کہ محیط برہانی یا محیط رضوی میں سے چالیس جلدوں پر مشتمل کتاب کون سی ہے، یہ بات بجائے خود اتنی اہم نہیں تھی جتنی اہم بنادی گئی، دونوں ضخیم کتابیں ہیں، اور کسی کتاب کا چالیس جلدوں میں ہونا یا کم جلدوں میں ہونا، کتابت، تحریر اور کتاب کے حجم اور سائز پر منحصر ہوتا ہے، آج صحاح ستہ کو ایک جلد میں سمو دیا گیا ہے، مسند احمد بن حنبل جیسی ضخیم کتابیں چھوٹے سائز میں آجاتی ہیں، لہذا چالیس جلدوں والا مسئلہ اہم مسئلہ نہیں تھا، آج جب کہ دونوں کتابیں چھپ کر سامنے آچکی ہیں تو دونوں ہی ۹/ جلدوں میں چھپی ہوئی ہیں، محیط رضوی کا وہ نسخہ جو دس یا بارہ جلدوں میں تھا، اس کے مخطوطات کے نسخے جو دستیاب ہیں تو کہیں ایک جلد میں پوری کتاب ہے جس کو ما قبل کے علماء نے دس یا بارہ جلدوں میں دیکھا تھا اور بیشتر یہ چار جلدوں میں ہے۔

جہاں تک یہ بات ہے کہ مفقود کون سی تھی اور موجود کون سی تھی تو یہ بات مطلقا کہنا تھوڑا دشوار ہے کیونکہ دونوں کتابوں کے حوالہ کتب فقہیہ میں ملتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ محیط برہانی کے مصنف چونکہ سمرقند وبخارا کے رہائشی تھے اس لیے ان کی کتاب دیار شام کے علاقے میں رواج نہیں پاسکی اور محیط رضوی کے مصنف کی آخری زندگی چونکہ دیار شام میں ہی گزری، اس لیے ان کی کتاب سمرقند وبخارا کے اہل علم سے مخفی رہی، چونکہ دونوں کتاب کا نام اور موضوع ایک تھا اس لیے علماء نے اپنی کتاب میں بسا اوقات کسی فرق اور امتیاز کے بغیر حوالے دیے، اس سے اشتباہ کو بڑھاوا ملا، جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ مشہور حنفی فقیہ ابن نجیم مصری کی اشباہ ونظائر کی کتاب میں محیط کے ۲۸

سے زائد حوالے ہیں، اور انہوں نے مقدمہ میں محیط کی نسبت سے رضوی سے کی ہے، اس سے واضح ہے کہ دیار شام کے علاقہ میں جو مفقود تھا وہ محیط برہانی تھا نہ کہ محیط رضوی۔

ابن امیر حاج کا بحر الرائق کے مصنف پر سخت تنقید

شیخ ابن نجیم مصری نے اپنے ایک رسالہ میں جو وقف کے موضوع پر تھا، اس میں مخالفین پر کسی سلسلے میں رد کرتے ہوئے محیط برہانی سے حوالہ دیا، اس پر شیخ ابن امیر حاج نے سخت نقد کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

أنه مفقود فی دیارنا وعلی تقدیر أنه ظفر به دون أهل عصره لم یحل النقل منه ولا الإفتاء عنه صرح به فی فتح القدیر من کتاب القضاء أنه لا یحل النقل من الکتب الغریبة وقد رأیت هذه العبارة بعینها وحروفها فی المحیط الرضوی فأخذها منه ونسبها إلی البرهانی ظناً منه أنه لا یطلع علی کذبه أحد(الفوائد البهیة فی تراجم الحنفیة،ص:190)

محیط برہانی ہمارے شہروں میں مفقود ہے، اور اگر مان لیا جائے کہ تنہا ابن نجیم مصری کو ہی محیط برہانی مل سکی اور کسی کو نہیں مل سکی تو بھی اس سے نقل کرنا اور اس سے فتوی دینا جائز نہیں، اس کی صراحت فتح القدیر میں کتاب القضا میں موجود ہے کہ نادر ونایاب کتب سے نقل جائز نہیں، جب کہ وہ عبارت (جو ابن نجیم مصری نے وقف کے مسئلہ میں محیط برہانی سے نقل کرنے کا دعویٰ کیا ہے) اس کو بعینہ لفظ بلفظ میں نے محیط رضوی میں پایا ہے، انہوں نے محیط رضوی سے مسئلہ اخذ کیا اور محیط برہانی کی جانب منسوب کر دیا، ان کو خیال ہوا کہ ان کے جھوٹ کی کسی کو خبر نہیں ہوگی۔

اسی طرح اشباہ ونظائر کے شارح نے بھی قیل سے نقل کیا ہے:

''ابن نجیم مصری کو نہ محیط برہانی کی خبر تھی اور نہ ذخیرہ برہانیہ کی''۔

حالانکہ یہ بات بھی درست نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ ذخیرہ کا نام تو ابن نجیم مصری نے صراحتاً اشباہ ونظائر کے مقدمہ میں لیا ہے اور بحر الرائق میں بھی ذخیرہ کے حوالے موجود ہیں، اس سلسلے میں غور وفکر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام ابن نجیم مصری نے محیط برہانی سے حوالے تو دیئے ہیں جیسا کہ بحر الرائق وغیرہ کے مطالعہ سے واضح ہے؛ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس محیط برہانی کا کوئی نسخہ نہیں تھا؛ بلکہ محیط رضوی کا ہی نسخہ تھا

اور جہاں محیط برہانی سے حوالہ دیا گیا ہے تو وہ کسی دوسری کتاب کے واسطے سے ہے؛ چونکہ بحرالرائق میں ایک مقام پر انہوں نے اس بات کا صاف صاف اعتراف کیا ہے یہ مسئلہ ان کو محیط رضوی میں نہیں ملا تو شاید یہ مسئلہ محیط برہانی میں ہو:

> وَفِي فَتْحِ الْقَدِيرِ مَعْزِيًّا إِلَى الْمُحِيطِ أَنَّ الْفَتْوَى عَلَى قَوْلِ مُحَمَّدٍ وَلَعَلَّهُ الْمُحِيطُ الْبُرْهَانِيُّ فَإِنَّهُ لَمْ أَجِدْهُ فِي الْمُحِيطِ الرَّضَوِيِّ وَهُوَ مُوَافِقٌ لِمَا صَحَّحَهُ فِي الْمَبْسُوطِ مِنْ أَنَّهَا لَا تُعْتَبَرُ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَتَصْحِيحُ الْهِدَايَةِ (البحر الرائق شرح كنز الدقائق ومنحة الخالق وتكملة الطوری:141/3)

(جاری ہے)

داعی، مجاہد اور فقیہ
شیخ یوسف القرضاویؒ

ساقی اِربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
(بانی وناظم المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

میری چہیتی بیٹی ''علا''، میرے جگر کا ٹکڑا، میرے دل کی زندگی، میری روح کی ٹھنڈک، میری پیاری بیٹی تم پر میرا پورا دل نثار ہے، میرے دل کی ساری محبت نثار ہے، میری محبت کی ساری صداقت نثار ہے، اور میری صداقت کا سارا خلوص نثار ہے، میری پیاری بیٹی سو دن سے زیادہ ہو گئے، تمہیں باغیوں اور سرکشوں کی جیلوں میں رہتے ہوئے، آہ مظلوم کے اوپر ظلم کے دن کتنے بھاری گزرتے ہیں، ایک دن ایک برس کے برابر لگتا ہے، مگر تسلی رکھو، اللہ نے چاہا تو ظلم کے یہ دن بھی ختم ہوں گے، اور تم اور تمہارے شوہر اپنے گھر والوں اور اپنے بچوں کے درمیان ضرور لوٹو گے، اس طرح کہ سلامتی تم پر سایہ فگن ہوگی اور اللہ کی رحمت کی تم پر بارش ہوگی۔

آخر یہ ظالم تمہارے ساتھ ایسی سنگ دلی کیوں کر رہے ہیں، تم کو ایک تنگ وتاریک کوٹھری میں تنہا رکھا گیا ہے، جہاں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کب دن ہوا اور کب رات ہوئی، بلکہ تم کو قید ہی کیوں کیا گیا، تم کو بنیادی حقوق سے کیوں محروم رکھا گیا، نہ کوئی تم سے مل سکتا ہے اور نہ

تمہاری صحت، اور دوا کا کوئی خیال اور انتظام ہے، لگتا ہے کہ اچانک انہیں یاد آگیا کہ تم قرضاوی کی بیٹی ہو، میری بیٹی تمہارا باپ بھی کون ہے، زندگی بھر دنیا والوں کے درمیان دین کے ساتھ چلتا رہا، لوگوں کو دین کی تعلیم دیتا رہا، فقیہ اور مفتی، داعی اور معلم، شاعر اور مصنف، کبھی امت کے ساتھ اس نے خیانت نہیں کی، کبھی اس نے اپنی امت کے مشن کے ساتھ بے وفائی نہیں کی، جب سے لوگوں نے اسے جانا ہے، اور نوے سال سے زیادہ عمر ہو جانے تک زندگی میں ایک بار بھی اپنی امت کو دھوکہ نہیں دیا، تمام براعظم کا سفر کیا، سارے اہم ملکوں کا دورہ کیا، لیکن کہیں بھی امت کے کسی مسئلہ کو فراموش نہیں کیا، مسلمانوں کے تعلق سے اپنی کسی ذمہ داری کو پورا کرنے میں ایک قدم پیچھے نہیں ہٹا، تمہیں یہ بات کس بات کی سزا دے رہے ہیں، یا تم پر ظلم کے پہاڑ توڑ کر تمہارے باپ کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں، انہوں نے تمہارے باپ پر بھی مقدمہ دائر کر رکھا ہے، الزام یہ ہے کہ اسی اور پانچ یعنی پچاسی سال کی عمر میں جیلوں میں گھس گیا تھا اور جیل سے قیدیوں کو نکال بھگایا تھا، یہ ظالم اپنے دل کا کینہ اور نفرت ایک آزاد خاتون پر انڈیل رہے ہیں، اسے شکست دینا چاہتے ہیں لیکن اللہ انہیں شکست دے گا، مجھے یقین ہے، میرا رب میری بیٹی کی نگہ داشت کرے گا، اپنی اس آنکھ سے جو سوتی نہیں ہے، میرا رب اس کی حفاظت کرے گا، اپنی اس پناہ میں جہاں کسی کی پہنچ نہیں ہے۔

میری بیٹی علا، تمہارے نام کا مطلب بلندی ہے، تو سمجھ لو کہ اللہ نے چاہا ہے کہ تمہارے نام کی برکت تمہیں حاصل ہو جائے، اس نے چاہا ہے کہ دنیا اور آخرت میں تمہارے درجات بلند کرے، ان آزمائشوں سے تمہاری نیکیوں کا ترازو بھاری کرے، تم جیل کی تنگ کوٹھریوں میں رہتے ہوئے اللہ کے نزدیک اونچے محل میں رہنے والے سرکش ظالم کے مقابلے میں بہت بلند ہو۔

جس مرد مجاہد اور غیرت مند اور ظالموں کے ظلم وجور سے بے پرواہ شخصیت نے یہ نامہ محبت اپنی جگر گوشہ کو لکھا ہے، وہ ہیں، ڈاکٹر شیخ یوسف قرضاوی، غور کیجئے کس قدر اللہ تعالیٰ پر یقین ہے، کس قدر بے خوفی ہے اعداء اسلام کی ستم رانیوں سے، اور کس قدر استغنا ہے دنیا کے مقام ومرتبہ سے، ہزار رحمتیں ہوں ان کی روح پر اور ان کی عزیمت کا کوئی حصہ نصیب ہو جائے ہر عالم دین کو۔

جن عرب علماء کی برصغیر کے اہل علم کے درمیان پذیرائی ہوئی ،اور برصغیر کے علماء نے ان کیلئے دیدہ ودل فرش راہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت ،افکار اور تصانیف سے استفادہ کیا، ان میں ایک نمایاں بلکہ سرفہرست نام شیخ یوسف القرضاوی کا ہے، شیخ یوسف قرضاویؒ ایک جید اور متبحر عالم دین، اعتدال وتوازن کا نمونہ، زمانی وعصری تقاضوں سے واقف ،بدلتے حالات میں احکام شرعیہ کی تطبیق کے ماہر، مقاصد شریعت پر گہری نظر، اصول دین میں متصلب ومتشدد اور فروعات میں رخصت وتیسیر کے داعی، تحریکات اسلامی کے اہم رہنما اور قائد، دین کی سربلندی کیلئے قید وبند اور جلاوطنی کی سختیاں جھیلے ہوئے، سرد وگرم چشیدہ ،دین کی خاطر عرب حکام اور والیان ملک سے آنکھیں ملا کر دوٹوک بات کرنے والے اور ان سب سے بڑھ کر تقریباً دوسو تصانیف کے ذریعہ امت کو احیاء اسلام کی فکر دینے والے ، لادینی نظریات اور ملحدانہ افکار کے سامنے بند باندھنے والے اور نوجوانوں کے دلوں میں ایمان ویقین کی چنگاری کو شعلہ جوالہ بنانے والی شخصیت کا نام ہے ۔

مختصر حالات زندگی:

انہوں نے جس گاؤں میں آنکھیں کھولیں، وہ وہی گاؤں ہے، جہاں مصر میں سب سے آخری صحابی رسول ﷺ حضرت عبداللہ بن حارث زبیدی نے آنکھیں بند کی تھیں، دوسال کی عمر تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، چودہ سال کے ہوئے تو والدہ نے بھی داغ مفارقت دیا، گھر کے لوگوں کا خیال تھا کہ یا تو بچہ کاشتکاری کرے یا پھر بڑھئی بن کر روزی کمائے، لیکن آپ کے دل میں علم کے حصول کا جذبہ موجزن تھا، بڑی محنت سے تعلیم حاصل کی، تعلیم میں ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہے، ازہر میں ثانویہ کی تعلیم کے دوران جب اخوان سے ربط کے الزام میں قید وبند کے مراحل سے گزرنا پڑا، تب بھی ثانویہ کے امتحان میں پورے مصر میں دوسرے نمبر پر آئے، ازہر سے ہی عالمیہ کا امتحان پاس کیا، انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن سے زبان وادب میں ڈپلوما حاصل کیا، ۱۹۶۰ء علوم القرآن کے مضمون میں ماسٹر کی ڈگری لی، اور یہیں سے پی ایچ ڈی بھی کیا، پی ایچ ڈی میں آپ کا مقالہ ’’الزکاۃ واثرہا فی حل المشاکل الاجتماعیۃ‘‘ (سماجی مسائل کے حال میں زکوۃ کا کردار'') کی اہل علم نے بہت داد دی اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا، تعلیم کے بعد تدریس کے شعبہ میں قدم رکھا اور اسی دوران انسٹی ٹیوٹ آف ٹریننگ برائے ائمہ کے ڈائریکٹر بھی مقرر ہوئے، ۱۹۶۱ء تک آپ نے مصر کے متعدد علمی، تحقیقی اداروں میں خدمات انجام دیں۔

اس کے بعد آپ قطر چلے گئے اور وہاں مختلف اداروں میں متنوع عہدوں پر کام کیا اور جہاں بھی رہے، وہاں اپنی صلاحیت، لگن اور محنت کی چھاپ چھوڑی، آپ نے دو شادیاں کیں، چار بیٹوں اور چار بیٹیوں کی نعمت

سے اللہ نے آپ کو نوازا، اور سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، وہ عرب ممالک جہاں کبھی آپ کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے عہدے، مناصب اور ایوارڈ کی پیشکش ہوئی تھی، کچھ ایسی مسموم ہوا چلی کہ ان ہی ممالک نے آپ کو دہشت گرد قرار دے دیا اور قطر سے جلاوطن کرنے یا ان ممالک کے حوالے کرنے پر پورا زور دیا، قطر نے ان ممالک کے مطالبہ پر دھیان نہیں دیا، اس کا خمیازہ بھی قطر کو بھگتنا پڑا لیکن قطر کی حکومت قابل مبارکباد ہے کہ جس نے متعدد پڑوسی ممالک کے دباؤ کے باوجود استقامت کا ثبوت دیا۔

شیخ قرضاوی کی شخصیت کے متعدد اور متنوع پہلو ہیں اور ہر پہلو'' کرشمہ دامن دل می کشد'' کا مصداق ہے جس میں ہمارے لیے عبرت بھی ہے، نصیحت بھی ہے اور کچھ کر گزرنے کا درس عزیمت بھی ہے۔

اسیری وجلاوطنی:

بہت سی شخصیات ایسی ہوئی ہیں، جو علمی اور فکری سطح پر بہت بلند تھیں لیکن جب ابتلاوآزمائش کا مرحلہ آیا تو ثابت قدم نہ رہ سکیں؛ لیکن شیخ قرضاوی ان لوگوں میں نہیں تھے، وہ علمی اور فکری بلندی کے ساتھ، جرات، عزیمت، بے باکی اور بے خوفی کی صفات سے متصف تھے، تعلیم کے دوران ہی اخوان المسلمون سے ربط کے الزام میں قید وبند کی سختیوں سے دوچار ہونا پڑا، بعد کی زندگی میں بھی قید وبند کی سختیوں اور تعذیب کے مراحل سے گزرنا پڑا، چار مرتبہ شیخ کو اخوان المسلمون سے ربط کی وجہ سے قید کیا گیا، پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء شاہ فاروق کے عہد میں، دوسری مرتبہ جنوری ۱۹۵۴ء میں جمال عبدالناصر کے عہد میں، تیسری مرتبہ ۱۹۵۴ میں ایک بار اور گرفتار کیا گیا اور چوتھی مرتبہ ۱۹۶۳ء میں گرفتار کیا گیا اور اس بار سخت اذیتیں بھی دی گئیں، آپ کی وجہ سے آپ کے اہل خانہ کو بھی قید وبند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا، آپ کی بیٹی کو قید کرلیا گیا اور دوران قید دوا اور علاج سے محروم کردیا گیا، اس دوران آپ نے اپنی بیٹی کو جو خط لکھا ہے، وہ درد اور محبت کی آمیزش کا ایسا شاہکار ہے جس کو پڑھ کر کوئی بھی حساس انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن اس کے ساتھ اس خط میں اپنے موقف کے صحیح ہونے، اس پر ڈٹے رہنے اور ساتھ ہی بیٹی کو صبر اور ثابت قدمی کی تلقین بھی ہے، اپنے زندان کے شب وروز کی کہانی خود شیخ یوسف القرضاوی نے رقم کی ہے جس سے اس قید خانہ کی ہولناکی سامنے آتی ہے، ان کی تحریر کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے، جس سے قید خانہ بلکہ اذیت خانہ کی ہلکی سی تصویر سامنے آتی ہے:

> پھر ہمیں'' حربی جیل'' میں ڈال دیا گیا، جس کی منظر کشی نہ الفاظ وحروف سے کی جاسکتی ہے اور نہ کوئی نثر اس کی متحمل ہے، نہ نظم میں اس کا اظہار ممکن ہے، زمانہ قدیم سے لوگ جیلوں سے واقف

ہیں، وہاں کی تعذیب وآلام کی تاریخ کا تذکرہ سنتے آئے ہیں، ہم نے فرانس کی Basille نامی جیل کے بارے میں سنا ہے، قیصر وکسری اور فرعونی دور کی جیلوں سے واقف ہیں، لیکن مصر کی حربی جیل ایسا ہولناک منظر پیش کرتی ہے جس کی نظیر ہمارے علم میں نہیں، اس قید خانہ میں انسانی تعذیب وتحقیر کے قدیم وجدید طریقے، نازی جرمنی، فاشسٹوں، کمیونسٹوں کے وحشیانہ اسالیب اکٹھے ہوگئے تھے، جنہوں نے انسانوں کی تحقیر، تذلیل، تکلیف وتعذیب اور ان کے افکار واخلاق پر غالب آنے کی کوشش میں اختیار کیا جاتا تھا۔

قید خانہ میں ہی شیخ کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ ان کے گھٹنوں کے اوپر دہی ڈال کر اسے کتوں سے چٹوایا جاتا تھا جس کی وجہ سے ان کے گھٹنوں میں مستقل درد رہنے لگا اور وہ قبل از وقت کرسی پر نماز پڑھنے پر مجبور ہوگئے۔

شیخ قرضاوی نے قید خانہ میں ہی اپنا مشہور قصیدہ نونیہ لکھا، جس کے حرف حرف سے ایمان ویقین کی چنگاری کی لپک اور دمک نمایاں ہے، اس کا ہر مصرعہ خرمن باطل کو خاکستر کرنے والا ہے، اس کا ہر شعر شک وارتیاب کے خس وخشاک کو بہا کرلے جانے والا سیل رواں ہے، جن میں سے بعض اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

تم میرے ہاتھوں میں بیڑیاں، گردن پر نوک خنجر اور پہلوؤں پر آگ کے کوڑے برساؤ، تب بھی میرے ایمان ویقین اور میری فکر کو تم پابند نہیں کرسکتے، یہ چیزیں میرے قلب کی گہرائی میں پیوست ہیں، اور اس دل پر صرف میرے رب کی حکمرانی ہے اور وہی میرا ہمساز، دم ساز اور ہمدرد ہے، میں جب تک زندہ رہوں گا، اپنے عقیدہ اور موقف پر قائم رہوں گا اور اگر اس راستے میں موت سے بھی سابقہ پڑے تو اس کو بھی خوشی سے گلے لگا لوں گا۔

یہی وہی بات ہے جسے فیض احمد فیض نے اس طرح نظم کیا ہے:

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

قیدخانہ میں گزارے ایام اور اخوان پر توڑے گئے ظلم وستم کے پہاڑ دیکھ کر ہی شاید شیخ قرضاوی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے:

صحابہ کرام کو جس طرح ستایا گیا اور انہیں اذیتیں دینے کے جو طریقے اختیار کیے گئے، ان سے ہم سب واقف ہیں، لیکن اخوان نے جو اذیتیں سہیں، وہ ان سے بڑھ کر تھیں، اس معنی میں کہ ان پر اذیتوں کے بدترین حربے استعمال کیے گئے، اور انتہائی گھناؤنے، وحشیانہ اور انسانیت سوز تجربات کیے گئے۔

شیخ کا مقصد صحابہ کرام پر توڑے گئے ظلم وستم سے تقابل اور برتری ثابت کرنا نہیں؛ بلکہ یہ بتانا ہے کہ صحابہ کرام کے دشمن اپنے اندر کچھ اخلاق و کردار رکھتے تھے، جب کہ اخوان کے دشمن اخلاق و کردار کی ہر صفت سے عاری اور اسیروں کو بشمول عورتوں اور بوڑھوں کو ایسی شرمناک سزا دینے میں بھی عار نہیں تھا جسے سننے کی بھی شریف انسان میں تاب نہ ہو۔

جرات و بے باکی نہایت اعلیٰ صفت ہے، اسی سے تمام مکارم اخلاق کی بنیاد پڑتی ہے، اس کے بالمقابل نفاق اور چاپلوسی کی صفت ہے جو تمام گھٹیا اور ذلیل صفات کی جڑ ہے، شیخ میں جرات و بے باکی کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ شیخ نے اخوان کی حمایت میں حکومت وقت سے ٹکر لی، سخت اذیتیں برداشت کیں؛ لیکن اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹے، انسان بسا اوقات دشمنوں کے خلاف تو بڑی مضبوطی سے کھڑا ہو جاتا ہے؛ لیکن اپنے دوستوں اور محسنوں کے خلاف ان کی کسی غلطی پر کھڑا ہونا، ان کو ٹوکنا آسان نہیں ہوتا، اور یہیں سے کسی شخصیت کے اصلی جوہر نمایاں ہوتے ہیں، شیخ کو اللہ تعالیٰ نے اس دور میں بلا خوف لومۃ لائم حق بات کہنے کی جرات عطا کی تھی اور اس میں وہ دشمن ہی نہیں دوستوں کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے۔

قطر ان کا وطن ثانی تھا، وہاں کے امیر نے ان کو ہر قسم کی سہولیات مہیا کیں، جب ان کے خلاف عرب ممالک نے اتحاد کر لیا اور ان کو دہشت گرد قرار دیا تب بھی قطر نے شیخ قرضاوی کا ساتھ نہیں چھوڑا؛ لیکن غلطیوں پر شیخ نے حکومت قطر اور اس کے امیر کو بھی برملا اور علی الاعلان ٹوکا، چنانچہ جب فلسطینیوں کا قتل عام کرنے والے، صبرا شاتیلا کیمپ کے قصائی اسرائیلی لیڈر ایریل شیرون کا قطری حکومت نے خیر مقدم کیا تو آپ نے کھل کر قطری حکومت کے اس قدم کی مذمت کی اور کہا:

قطر کے لیے انتہائی ذلت کی بات ہے کہ وہ اپنی سرزمین پر شارون جیسے مجرم کا استقبال کرے،

اس کی آمد نامبارک اور منحوس ہے، میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جو' قانا'' کے قاتل شمعون پیری سے مصافحہ کرے، اس کا ہاتھ نجس وناپاک ہوگیا، اس کو چاہیے کہ وہ اپنے ہاتھ کو سات دفعہ دھوئے اور ایک بارمٹی سے پاک کرے، جس طرح کتے کے جھوٹے برتن کو پاک کیا جاتا ہے، اب میں با نگ دہل کہتا ہوں کہ جو شخص ایریل شارون جیسے قاتل، سفاح اور مجرم سے ہاتھ ملاتا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے ہاتھ ستر دفعہ دھوئے اور پاک کرے۔

اسی طرح ڈنمارک کے جس اخبار نے آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی کی تھی، اس میں کام کرنے والے صحافی کی قطر آمد کا علم جب شیخ کو ہوا انہوں نے پرزور انداز میں حکومت کے سامنے یہ بات اٹھائی اور کہا کہ ایسے ملعون شخص کو تو قطر میں داخل ہی نہیں ہونے دینا چاہئے۔

شیخ کی یہی جرات، بے باکی اور بے خوفی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ تھا جس نے عرب حکومتوں کو ان کے خلاف کر دیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ عرب کی وہ حکومتیں جنہوں نے کبھی ان کو اپنے اعلیٰ ترین ایوارڈ کا حقدار ٹھہرایا تھا، حق گوئی کی پاداش میں دہشت گرد قرار دے دیا، یہ بھی شاید امریکہ سے ہی سیکھا ہوا سبق ہو، طالبان جب تک روس کے خلاف تھے، امریکہ کیلئے مجاہد تھے اور جب امریکہ کے خلاف ہوئے تو دہشت گرد ہو گئے، جب تک شیخ نے اشتراکیت اور کمیونزم کی مخالفت کی، تب تک وہ عرب حکمرانوں کے چہیتے رہے اور جیسے ہی ان کی تنقید کا رخ عرب حکمرانوں کی جانب ہوا، تو ان کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا۔

اسرائیل کے خلاف موقف:

شیخ قرضاوی کا اسرائیل کے خلاف اور فلسطینیوں کی حمایت کا موقف بڑا واضح اور غیر مبہم تھا اور ابتدا سے آخر تک اس میں انہوں نے کوئی لچک نہیں دکھائی، اس وقت بھی نہیں جب کہ عرب ممالک اسرائیل کے خلاف تھے اور تب بھی نہیں جب امریکہ کے اشارہ پر عرب ممالک نے اسرائیل کو کھلے عام یا درپردہ تسلیم کرلیا اور اسرائیل کے مخالفین کے خلاف ملک میں موجود اہل علم پر زندگی دشوار کردی، شیخ اپنی خودنوشت ''ابن القریۃ والکتاب ملامح ومیرۃ'' میں لکھتے ہیں:

جو مسائل میرے دل ودماغ کی گہرائی میں پیوست اور جاگزیں ہیں، ان میں سے ایک بلکہ سرفہرست مسئلہ فلسطین رہا ہے، ۱۹۴۰ء سے تاحال ہر سال میں برطانوی وزیر خارجہ کے بالفور ڈیکلریشن کے خلاف احتجاجی مظاہروں میں شامل ہوتا رہا ہوں، اسی اعلان میں یہودیوں سے

وعدہ کیا گیا تھا کہ ان کیلئے فلسطین میں ایک قومی ریاست قائم کی جائے گی۔

فقہ الجہاد میں آپ اسرائیل کی دہشت گردانہ بنیادوں کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسرائیل وہ ریاست ہے جس کی بنیاد روز اول سے دہشت گردی پر قائم ہے، یہ Haganah (یہودیوں کی فوجی تنظیم) کے غنڈوں کی دہشت گردی اور ان کے ذریعہ دیر یاسین اور دیگر مقامات پر فلسطینیوں کا قتل عام کرکے اہل فلسطین کو جبراً ان کے گھروں سے نکال کر قائم کی گئی ایک ریاست ہے، لہذا اہل فلسطین جو کچھ کر رہے ہیں، وہ جہاد اور استقامت ہے، وہ اپنی سرزمین اور اپنے حق کی بازیابی کیلئے مزاحمت کر رہے ہیں، اگر اس مقاومت کا نام دہشت گردی ہے تو وہ ہمیں دہشت گرد کہتے رہیں۔

شیخ نے مسئلہ فلسطین اور اسرائیل کی مقاومت اور مزاحمت کرنے والے مجاہدین کیلئے خودکش حملوں کو جائز قرار دیا، ان کے اس فتویٰ پر بڑی لے دے ہوئی، درباری علماء سے لے کر امریکی اور یوروپی میڈیا تک نے اس پر بڑا واویلا مچایا اور اس کو دہشت گردی کی حمایت کا نام دیا؛ لیکن شیخ اپنے اس موقف پر ڈٹے رہے، اور لاکھ دباؤ کے باوجود بھی اس سے پیچھے نہیں ہٹے، شیخ کا خودکش حملوں کو جائز قرار دینا مطلقاً نہیں تھا؛ بلکہ فلسطین کیلئے خاص تھا اور وہ بھی کچھ خاص شرائط کے ساتھ تھا، اور یہ حقیقت ہے کہ شیخ کے اس فتوی سے مجاہدین کو بڑی مدد ملی اور ان کیلئے اسرائیل کے ٹینکوں کا مقابلہ نسبتاً آسان ہوگیا۔

مسجد اقصی کی حفاظت:

مسجد اقصیٰ مسلمانوں کی تیسری سب سے مقدس مسجد ہے جس کی فضیلت قرآن وحدیث میں واضح طور پر بیان کی گئی ہے، اور اسلام کی تاریخ میں اس کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے، آج امت مسلمہ بالخصوص حکمرانوں کی کمزوری کی وجہ سے ایک چھوٹا سا غاصب ملک اس پر قابض ہے اور اس کی دن رات یہ کوشش ہے کہ کسی طرح مسجد اقصی کو ڈھا کر اس پر ہیکل سلیمانی تعمیر کرے، شیخ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسجد اقصی کی حفاظت کیلئے پوری دنیا میں آواز لگائی، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی آواز پر دنیا بھر کے مسلمانوں نے لبیک کہا؛ لیکن مسلمانوں کے درمیان ہلچل ضرور پیدا ہوئی اور اس کے بارے میں مسلمانوں میں بیداری آئی، مغرب کی مشہور جرنلسٹ مریم (سابقہ نام یون ریڈلے جو طالبان کی قید میں آئی اور ان کے کردار وحسن عمل سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا) اپنے ایک مضمون میں اس بارے میں شیخ کی کوششوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

اگرانہوں نے مسجد اقصی کی حفاظت کیلئے عالمی پیمانے پر مہم نہیں چلائی ہوئی اوراس کے حق میں آواز اٹھانے کیلئے ایک مستقل فورم ''القدس انٹرنیشنل فاؤنڈیشن'' نہیں بنایا ہوتا تو مجھے نہیں معلوم کہ یہودی شرارت پسند ٹولہ اب تک مسجد اقصی کے ساتھ کیا کچھ کر چکا ہوتا، اوراس کو بچانا بھی دائرہ امکان میں ہوتا یا نہیں ہوتا، یہ شیخ قرضاوی کی جہد مسلسل کا ہی نتیجہ ہے کہ آج کی نئی نسل اور دنیا بھر میں بسنے والے مسلمان مسجد اقصی کی تاریخ سے آگاہ ہیں۔

انتہا پسندی کی مخالفت:

اگر چہ شیخ نے جائز وجوہات سے مزاحمت کرنے والے مجاہدین کی حمایت کی تو ایسی تنظیموں کی بھی برملا اور کھل کر مخالفت کی جو مسلمانوں کے خلاف ہی سرگرم عمل ہیں اور انہوں نے مسلم ممالک میں ہی اور مسلمانوں کے خلاف ہی قتل وغارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے، شیخ نے صاف لفظوں میں ایسی تنظیموں کے عمل کو غیر اسلامی قرار دیا اوران کی کتاب فقہ الجہاد اس موضوع پر عرب علماء کے نزدیک اب تک کی سب سے بہترین کتاب ہے، جس میں وضاحت کے ساتھ جہاد کی حقیقت، اس کے شرائط، اور جہاد کے نام پر مسلم دنیا میں قتل وغارت گری کا بازار گرم کرنے والی تنظیموں کی حقیقت سے دنیا کو واقف کرایا گیا ہے، اورصاف الفاظ میں شیخ قرضاوی نے یہ بات کہی ہے کہ ایسی تنظیمیں جو مسلم دنیا میں اور مسلمانوں کے خلاف ہی سرگرم عمل ہیں، وہ اسلام دشمن طاقتوں کے گماشتے اورایجنٹ ہیں، اور وہ اسلام کی خدمت نہیں کر رہی ہیں بلکہ اسلام کو پوری دنیا میں بدنام کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔

شیخ کے اوصاف واخلاق:

شیخ پورے طور پر سنت نبوی ﷺ کے متبع تھے، ان کی ذاتی زندگی سیرت نبوی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، علمی اور دنیاوی اعتبار سے بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود انکسار وتواضع ان کی شخصیت کا حصہ تھا، جس سے بھی ملتے، جھک کر ملتے، سامنے والے کو اپنے بلند قد کا احساس نہ ہونے دیتے، ان کا انکسار ہی ان کی بڑائی اورتواضع ہی ان کی بلندی تھی، ان کے اندر خشیت انابت، رجوع الی اللہ اور محاسبہ نفس کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ انہوں نے اپنے اعمال کی بنیاد قرآن اور صحیح احادیث پر رکھی تھیں، اس لیے وہ ضعیف اور موضوع احادیث پر عمل کرنے سے خود بھی بچنے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے اور تصوف میں جو غیر اسلامی نظریات اور دوراز کار بحثیں شامل ہوگئیں ہیں، اس کے بھی وہ مخالف تھے؛ لیکن وہ تصوف جس کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہے، تزکیہ نفس پر ہے، اپنے دل کو

رذائل سے خالی کرنے اور فضائل سے آباد کرنے پر رہے، وہ اس کے پرزور داعی اور عامل تھے۔

تصانیف:

شیخ متبحر عالم تھے اور ان کے علم کا نمایاں حصہ فقہ اسلامی تھا، فقہ اسلامی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا رشتہ ایک طرف قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے قول وعمل سے جڑا ہے تو دوسری طرف زندگی کے تقاضوں، بدلتے حالات اور زمانی تغیرات سے بھی ہر آن اور ہر لمحہ اس کا تعلق ہے، اور یہی چیز فقہ کے فن کو دیگر علوم وفنون کے درمیان نمایاں اہمیت دلاتی ہے، فقہ اسلامی میں آپ کی مہارت، رسوخ اور گہرائی وگیرائی کی سبھی نے داد دی ہے، آپ کی پہلی باضابطہ تصنیف ''الحلا ل والحرام'' ہے، جو فقہ کے ہی موضوع پر ہے اور بعد میں اس میں کچھ اضافہ بھی آپ نے کیا ہے، اسی طرح ''فقہ الزکاۃ'' زکاۃ کے موضوع پر اب تک لکھی گئی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے، ''فقہ الجہاد'' پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے بارے میں عرب کے بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ اگر شیخ قرضاوی کچھ بھی نہ لکھتے اور صرف فقہ الجہاد ہی لکھتے تو یہ ان کے علم وفضل کا مرتبہ جاننے کیلئے کافی ہوتی، شیخ نے ''فقہ المقاصد'' پر بھی لکھا اور خوب لکھا اور مقاصد شریعت کی گہرائی میں ڈوب کر لکھا ہے اور مقاصد شریعت کو موجودہ حالات پر کیسے منطبق کرنا ہے کہ جس میں نہ قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے تعامل کا رشتہ کمزور ہو اور نہ ہی عصری وزمانہ تقاضوں سے آنکھیں موندنے کی نوبت آئے، اسی طرح مسلم تنظیموں کے درمیان جس طرح کی منافست، رقابت اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کی جارہی ہے اور خود کو برسرحق اور دوسرے کو ضال ومضل سمجھا اور بتایا جارہا ہے، اس پر بھی شیخ قرضاوی نے قلم اٹھایا اور فقہ ''الاختلاف'' کے موضوع پر ایک بیش قیمت کتاب کا اضافہ کیا ہے، ان کی اس کتاب کی داد خود شیخ عوامہ نے دی ہے؛ حالانکہ شیخ عوامہ خود اس موضوع پر دو بیش قیمت کتابوں کے مصنف ہیں، ''فقہ الاولویات'' لکھ کر آپ نے امت کے سامنے ترجیحات کا مسئلہ طے کیا اور بتایا کہ ہم تمام مسائل بیک وقت حل نہیں کرسکتے، اس سلسلے میں ہمیں ترجیح کے اصول کو اپنانا چاہیئے اور اہم مسائل کو ترجیح دینا چاہیئے ''فقہ الاولویات'' اپنے موضوع پر منفرد اور انوکھی کتاب ہے، حقیقت یہ ہے کہ ''فقہ الاقلیات'' اور ''فقہ الاولویات'' لکھ کر آپ نے فقہ کی نئی شاخوں کو مستقل شکل دی اور اس سے غور کرنے کی ایک نئی جہت سامنے آئی۔

فتاویٰ:

آپ نے عصری مسائل پر جو کچھ لکھا یا لوگوں کے استفسار پر جو جوابات دیئے ہیں، ان سے فتاوی کا ایک ضخیم مجموعہ تیار ہوچکا ہے جو کئی جلدوں میں شائع ہوچکا ہے، شیخ کے اس مجموعہ فتاوی کی خاص بات یہ ہے کہ اس

میں زمانی تقاضوں اور تغیرات کا پورا خیال اور لحاظ رکھا گیا ہے، یہ ضروری نہیں کہ ان کی تمام آراء سے اتفاق کیا جائے لیکن یہ بات بلا شک وشبہ کہی جا سکتی ہے کہ شیخ اپنی رائے ظاہر کرنے میں -جس کو اپنے علم کی روشنی میں درست سمجھتے تھے- بڑے جرات مند تھے، ایک مرتبہ جب کسی رائے کی اصابت پر ان کو اطمینان خاطر ہو جاتا تھا تو پھر وہ اس کا کھل کر اعلان کرتے تھے، چاہے کتنے ہی لوگ اس کے مخالف ہوں۔

شیخ کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نومسلموں کے مسائل، پریشانیوں، اور تکالیف کو گہرائی سے سمجھا، اسی طرح یوروپ، امریکہ اور ایسے ممالک جہاں مسلمانوں کا اقتدار نہیں ہے، وہاں بسنے والے مسلمانوں کے درد کو اور پریشانیوں کو جانا، یہ حقیقت ہے کہ ایک مسلم ملک میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو، اقتدار مسلمانوں کا ہو اور ایسا ملک جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہوں، اقتدار غیر مسلموں کا ہو، دونوں کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے، اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنا بسا اوقات بڑی پریشانی کا باعث بنتا ہے، اور جو لوگ اس فرق کو نظر انداز کرتے ہیں، ان کی وجہ سے لوگ پہلے احکام اسلام اور پھر دین سے ہی بیزار ہونے لگتے ہیں، شیخ قرضاوی ایسے مفتی نہیں تھے جس نے کتاب کھولی، کوئی جزئیہ دیکھا اور اس کے مطابق فتوی دے دیا، چاہے فتوی طلب کرنے والے کے حالات کیسے ہی ہوں، اور عصر حاضر میں اس جزئیہ پر عمل کتنا ہی دشوار ہو؛ بلکہ وہ خود کو سوال کرنے والے کی جگہ پر رکھ کر سوچتے تھے، اور مستفتی کے ساتھ پوری ہمدردی، دلسوزی اور ہمدردی کو ملحوظ خاطر رکھ کر فتوی دیا کرتے تھے۔

آسانی اور سہولت:

شیخ قرضاوی مسائل کے حل میں شریعت اسلامی کے ایک اہم اور بنیادی عنصر ''تیسیر'' سے کام لیتے تھے، یعنی جہاں تک قرآن وحدیث کی روشنی میں لوگوں کو سہولت فراہم کی جا سکتی ہو، فراہم کی جائے، اس میں قرآن وحدیث کے معانی کی عمومیت، مقاصد شریعت اور زمانہ کے تغیرات اور عرف وعادت کا بھی لحاظ وخیال رکھا جائے، یہی وجہ ہے کہ بعض گوشوں سے ان کے بعض فتاوی پر سخت تنقید ہوئی، بلکہ بعض اوقات تو ان کی نیت تک پر حملہ کیا گیا، ان کے فتاویٰ سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے اور یہ ہر صاحب علم کا حق ہے؛ لیکن نیت پر حملہ کا حق کسی کو نہیں، اس کا علم تو صرف اسی ذات کو ہے جو دلوں کا بھید جاننے والی ہے۔

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ شیخ کے یہاں صرف تیسیر ہی تیسیر تھا، بلکہ وہ اس معاملہ میں متوازن اور معتدل موقف رکھتے تھے، شریعت اسلامی کی بنیادوں، قرآن وحدیث کے نصوص میں تحریف وتبدیلی اور تجدید کی جگہ تجدد پسندی کے سخت خلاف تھے، اور کھل کر اس کی مذمت کرتے تھے، مصر میں اور بعد کی علمی زندگی میں بھی

وہ ہمیشہ تجدد پسندوں سے معرکہ آراء ہوئے، اس سلسلے میں شیخ کی تحریریں بصیرت افروز ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ وہ جمود پسند علماء سے بھی نالاں تھے، جن کا شیوہ آئین نو سے ڈرنا اور طرز کہن پڑ اڑنے والا ہوتا ہے، وہ جدید تقاضوں، نئے حالات، زمانہ کی تبدیلی سب سے آنکھیں مونڈ کر فقہ کی جزئیات تک محدود رہتے ہیں، جس کی وجہ سے امت کے افراد پر پہلے تو زندگی دشوار ہوتی ہے، پھر بعد میں وہ سوچنے لگتے ہیں کہ شریعت اسلامی میں زمانہ کے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی اہلیت نہیں ہے، اور اس طرح یہ لوگ باوجود مخلص ہونے کے اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں، اور بسا اوقات ان کی وجہ سے اسلام پر لوگوں کا اعتماد کمزور ہو جاتا ہے۔

شیخ نے بعض مسائل میں اپنی الگ راہ نکالی ہے اور جمہور سے ہٹ کر اپنے علم اور دلائل کی بنیاد پر رائے قائم کی ہے، ہر صاحب علم کو اس کا حق ہے اور یہ فطری بات ہے بقول غالب ''ہر کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد''، ہر صاحب نظر مکمل طور پر اپنے بزرگوں کی پیروی نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنی الگ راہ نکالتا ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہوتی ہے، شیخ نے بھی بعض مسائل میں یہ کیا ہے، ان سے علمی بنیادوں پر اختلاف تو کیا جاسکتا ہے اور کرنا چاہئے اور شیخ اگر کسی مسئلہ میں غلط ہیں تو ان کی غلطیوں کو واضح کرنا چاہئے، اور شیخ نے اپنے اوپر کیے گئے نقد کو ہمیشہ خوش دلی سے قبول کیا اور جب ان سے کوئی بات دلائل وشواہد کے ساتھ کی گئی اور ان پر واضح ہو گیا کہ ان کا موقف غلط ہے تو انہوں نے کھلے عام اپنی غلطیاں بھی تسلیم کی ہیں، لہذا شیخ پر علمی نقد تو ہونا چاہئے کہ امانت کا تقاضا یہی ہے؛ لیکن بعض گوشوں سے جس طرح ان پر سب وشتم کیا گیا، ان کو دشمنان دین کی فہرست میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی، ان کی نیت اور ارادوں کو ہدف بنایا گیا ہے، وہ غیر علمی رویہ ہے اور ناقدین کی سطحی ذہنیت کو نمایاں کرتا ہے۔

تحریکات میں شرکت

شیخ بنیادی طور پر مدرس، محقق اور مصنف تھے، ان کے تلامذہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، اسی کے ساتھ آپ کی تحقیقات اور تصنیفات کی بھی بڑی تعداد ہے، عموماً ہوتا یہ ہے کہ جو شخصیات تدریس وتحقیق کے شعبہ سے وابستہ ہوتی ہیں، ان کیلئے تحریکات میں سرگرم شرکت صبر آزما ہوتی ہے، اور جو شخصیات تحریکات سے وابستہ ہوتی ہیں، ان کیلئے تصنیف وتحقیق کے دماغ سوزی جیسے مرحلے دشوار ثابت ہوتے ہیں، لیکن شیخ یوسف قرضاوی کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے تحریکات میں سرگرم شرکت کو بھی بخوبی نبھایا اور اسی کے ساتھ تصنیفات کا بھی انبار لگا دیا، جن میں سے ہر تصنیف اپنے موضوع پر منفرد اور بیش قیمت ہے اور ملت اسلامیہ کو درپیش مشکلات کا حل پیش کرتی ہے۔

شیخ قرضاوی اخوان المسلمون سے وابستہ تھے،اوراس سلسلے میں ان پر جو کچھ افتاد پڑی،اورصرف ان پر ہی نہیں،ان کے پورے خاندان پر،اس کو ہنسی خوشی برداشت کیا،اخوان کے ساتھ ساتھ شیخ دنیا بھر میں اسلام کی سربلندی کی خواہاں تنظیموں سے ربط میں تھے،اوران کی رہنمائی فرماتے تھے،عام طور پر کسی تنظیم سے وابستہ لوگوں میں جو گروہ بندی پیدا ہوتی جاتی ہے اور دوسری تنظیموں اورتحریکوں کے سلسلے میں تنگ نظری آجاتی ہے،شیخ اس سے کوسوں دور تھے،وہ اعلاء کلمۃ اللہ کے خواہاں تھے اوراس سلسلہ میں سرگرم دنیا بھر کی تنظیموں اورتحریکوں کی حمایت زبان وقلم سے کرتے تھے اوروقت ضرورت ان کو مفید مشورے بھی دیتے تھے،جب انہوں نے عرب دنیا کی ایک مشہور تنظیم جو دنیا بھر میں مسلمانوں کو آپس میں مربوط کرنے کیلئے قائم کی گئی تھی،بے اثر ہوتے اورحکام وقت کے اشارہ وفرمان پر چلتے دیکھا تو پھر انہوں نے خود ایک تنظیم **الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین** اسی مقصد کیلئے قائم کی،مقصد یہ تھا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو جوڑا جائے،اورسب کو جسد واحد اس طرح بنادیا جائے کہ وہ "**بنیان مرصوص**" بن جائیں اورسب ایک دوسرے کا دکھ درد اسی طرح محسوس کریں جیسے آنکھ جسم کے ہرعضو کا دکھ درد محسوس کرتی ہے:

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

مسلمانوں پر علماء کا اثر ایک محسوس حقیقت ہے،شیخ نے علماء کرام کے ذریعہ سے تمام مسلمانوں کو جوڑنے کی کوشش کی،اورکیونکہ علماء کے ذریعہ ہی مسلک ومشرب کا اختلاف ہے،جب علماء آپس میں جڑیں گے تو ان میں مسلک ومشرب کا تشدد بھی کم ہوگا اوران کے واسطے سے دنیا بھر میں مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی شدت میں کمی آئے گی،یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ شیخ کی یہ تحریک سوفیصد کامیاب رہی،لیکن اس نے علماء کو صحیح سمت کی رہنمائی کی اوران میں راہ حق پر استقامت کا جذبہ پیدا ہوا۔

شیخ قرضاوی اور میرا تعلق

شیخ یوسف قرضاوی سے ملاقات کا نہیں،بلکہ دور سے دیکھنے کا موقع سب سے پہلے دیوبند کے جشن صد سالہ میں ملا،کھلا ہوا رنگ،اوسط درجہ کا لحیم وشحیم جسم،چہرہ پر مختصر ڈاڑھی،سر پر ازہری ٹوپی،جسم پر جبہ زیب تن،اس وقت ڈاڑھی کے بال بھی سیاہ تھے،انہوں نے بہت ہی عالمانہ اورداعیانہ خطاب کیا،حاضرین کی تعداد اتنی بڑی تھی کہ وہ اس پر تاثر کا اظہار کیے بغیر نہیں رہے،بعد میں جب ایک دفعہ ان کے دولت خانہ پر ان سے ملاقات ہوئی تب بھی انہوں نے دیوبند کے اس اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے میدان عرفات کے علاوہ کہیں اتنا بڑا

مجمع نہیں دیکھا، انہوں نے اپنے خطاب میں دیوبند کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا، خاص طور پر مسلمانوں کے اتحاد کی دعوت دی، دیوبند، ندوہ، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان مختلف اداروں اور تحریکوں کو اپنے اپنے میدانوں میں ایک دوسرے کا اعتراف اور تعاون کرتے ہوئے کام کرنا چاہیے، اس وقت کے ماحول میں اور دیوبند کے اسٹیج سے یہ بات کہنا غیر معمولی بات تھی۔

شیخ قرضاوی کو دوسری بار حیدرآباد میں سننے کا موقع ملا، جب یہاں پہاڑی کے دامن میں وادیٔ ہدیٰ میں جماعت اسلامی ہند کا سالانہ اجتماع تھا، اس وقت مولانا محمد یوسف صاحب جماعت کے امیر تھے، اس میں ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند سے بھی بہت سے علماء اور عالم عرب سے بھی بعض مفکرین شریک ہوئے تھے، ان میں سب سے ممتاز نام شیخ یوسف القرضاوی کا وتھا، یاد آتا ہے کہ اس اجلاس میں ڈاکٹر احمد اترجی کا بھی خطاب ہوا تھا، جماعت اسلامی سے نہ اس وقت تعلق تھا اور نہ اب ہے؛ مگر پورے ملک اور بیرون ملک سے آنے والے بڑے بڑے اہل علم کے دید وشنید کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ میں کشاں کشاں اجتماع گاہ میں پہنچ گیا، اجتماع گاہ کو بھی بڑے سلیقے کے ساتھ سجایا اور سنوارا گیا تھا، پتھر کی چٹانوں پر جگہ کی مناسبت سے کچھ اس طرح آیت قرآنی کی کتابت کرائی گئی تھی جو قلب ونظر کو اپنی طرف کھینچتی تھی، اس اجتماع میں بھی سب سے زیادہ مجمع قرضاوی صاحب کے خطاب میں نظر آیا، مگر ظاہر ہے کہ میری حیثیت دور اور اسٹیج سے نیچے بیٹھ کر دیکھنے کی تھی، اس وقت قریب سے دیکھنے اور بات کرنے کا سوال نہیں تھا۔

پھر جب میں مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ کا رکن منتخب ہوا اور اس کے سمیناروں میں شرکت کرنے کا موقع ملنے لگا تو شیخ قرضاوی بھی اس کے رکن رکین تھے، اور وہ زبان وبیان کے غیر معمولی مہارت اور معلومات کی کثرت کی وجہ سے مجمع پر چھا جاتے تھے، اس لیے سمیناروں میں ان کا بڑا مقام ہوتا تھا، البتہ شیخ قرضاوی ہم لوگوں کے مقابلہ سہولت کے پہلو کو قبول کرنے میں آگے تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کثرت سے مغربی ملکوں میں جاتے تھے، اور وہاں کے مسلمانوں کی دشواریاں ان کے سامنے تھیں، اس لیے وہ مائل بسہولت ہوا کرتے تھے، مجھ جیسے لوگ بھی اگر چہ عرف وحالات کی تبدیلی کی وجہ سے اور مسلم اقلیتوں کے اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے معاملات میں نرم پہلو کا رجحان رکھتے ہیں؛؛ لیکن اس حد تک نہیں جا پاتا، جہاں تک قرضاوی پہنچ جاتے تھے، اس لیے بہت سے مسائل میں رائے کا اختلاف پایا جاتا تھا، اور بعض دفعہ میں نے ان کی رائے پر پورے ادب واحترام کے ساتھ تنقید بھی کی اور انہوں نے اس کا برا نہیں مانا، بہر حال ان مجلسوں میں شیخ قرضاوی کو قریب سے دیکھنے اور ان کی بات سننے کا موقع ملا، اور اس وقت مجھے ان کی بلند اخلاقی، خورد نوازی خود دیکھنے کا موقع ملا۔

ان کی تصنیفات علمی جامعیت، زمانہ شناسی اور ملی مسائل کی فہم وشعور کی واضح مثال ہیں، اب تو ان کی تصنیفات ایک موسوعہ کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں،لیکن مجھ کو سب سے بڑھ کر ان کی جرأت وہمت نے متاثر کیا، رمضان المبارک میں سعودی عرب کے بادشاہ ملک عبداللہ کی طرف سے ایک ہفتہ کیلئے پوری دنیا کے منتخب علماء کو مدعو کیا گیا،غالباًان کی تعداد پندرہ بیس تھی ، ہندوستان سے میں حقیر موجودتھا،شاہی محل میں افطارکا اہتمام تھا، اورافطار سے قبل دیوانیہ میں نشست اس طرح رکھی گئی کہ حرم شریف کے ایک امام اور ایک مہمان دونوں کی کرسیاں ساتھ ساتھ،کلمۃ الضیف کیلئے شیخ قرضاوی کاانتخاب ہوا،سعودی عرب میں اس وقت مغرب نوازی نہیں تھی،صلیبی اور یہودی قوتوں کے سامنے سربسجود ہوجانے کی کیفیت چل رہی تھی ،یہ زمانہ اس کا نقطۂ آغاز تھا،تو بادشاہ کے سامنے کوئی خلاف مزاج بات کہنا آسان نہیں تھا،اور یہ معتوب ہونے کیلئے کافی تھا،افطار سے پہلے جب شیخ قرضاوی کو خطاب کی دعوت دی گئی تو انہوں نے ایسا خطاب کیا جو حکمت وجرأت کا امتزاج تھا، انہوں نے پہلے تو حجاج ومعتمرین کی خدمت کے سلسلے میں سعودی حکمرانوں کی تعریف کی، پھر کہا:

> یہاں ہمیشہ مہمان بلائے جاتے ہیں لیکن آج جو مہمان بلائے گئے ہیں، وہ ان سے بہت مختلف ہیں، یہ آپ کے ناصحین اور بہی خواہان ہیں، جو خوشامدانہ باتیں نہیں کہتے ہیں ؛لیکن وہ اس سرزمین کے ذرہ ذرہ سے محبت رکھتے ہیں،اورآپ کے حقیقی خیرخواہ ہیں،اور جو دوسرے لوگ آتے ہیں، وہ مادحین ،چاپلوس، بے جا تعریفیں کرنے والے اورخوشامد کرنے والے اپنی غرض کیلئے آت ہیں، آپ کی غرض کیلئے نہیں آتے، پھر انہوں نے کہا کہ سعودی عرب مذہب اور سیاست کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہے، جہاں ملک عبدالعزیز میدان سیاست کے شہسوار تھے، وہیں محمد بن عبدالوہاب دین حق کے داعی تھے، اس لیے اس ملک میں ہمیشہ دین و سیاست کے درمیان مضبوط رشتہ ہونا چاہئے ،ایسا نہ ہو کہ سیاسی مدوجزر غالب آجائے اور دین مغلوب ہوتا چلا جائے ۔

سارا مجمع دم بخود تھا؛ کیونکہ بادشاہ اوران کے مصاحبین کے سامنے یہ سب کہنا علم بغاوت بلند کرنے سے کم نہیں تھا، بہرحال ملک عبدالعزیز نے بہت صبر کے ساتھ ان کا پورا خطاب سنا،اوراخیر میں ایک دو جملہ کہہ کر اپنی بات ختم کی۔

پھر اسی دن شب میں سحری کی دعوت نائف بن عبدالعزیز کے محل میں تھی جو بادشاہ کے ولی عہد تھے ؛مگر سعودی روایت کے برخلاف ان کا چہرہ ڈاڑھی سے بالکل صاف تھا، جب میں نے پہلے پہل ان کی تصویر دیکھی

اور پھر بالمشافہ ملاقات کی تو میرا پہلا احساس یہ تھا کہ یہ ایک عام سے آدمی ہیں؛ لیکن جب ان کی گفتگو سنی تو اندازہ ہوا وہ بہت ذہین اور بہت باخبر شخصیت ہیں، خاص کر مسلم تاریخ اور دنیا کے موجودہ حالات پر بھی گہری نگاہ تھی، انہوں نے عالم اسلام پر گفتگو کرتے ہوئے اخوان المسلمون پر سخت تنقید کی اور کہا کہ سعودی عرب نے اخوان کی اتنی زیادہ حمایت کی، ان کا تعاون کیا، اس کے لوگوں کو پناہ دی؛ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، غالباً اس وقت حسنی مبارک مصر میں اقتدار پر آچکے تھے، یا آنے کے قریب تھے، شیخ قرضاوی نے مدلل طور پر ان کی تردید کی اور اخوان کی تحریک نے جس طرح عالم عرب کے نوجوانوں کو اسلام پر قائم رکھا اور الحاد و دہریت سے بچایا، اس کو واضح کیا، نائف کے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا، جواب ہوتا بھی کیا؟ شیخ قرضاوی کے نزدیک اہمیت تھی اسلامی اقدار اور اسلام کی سربلندی کی، اور نائف کے نزدیک اہمیت تھی سیاسی فتوحات اور معاشی ترقی کی، دین کے سربکف سپاہی اور دنیا کے طلب گار شخص کے درمیان کس طرح موافقت ہو سکتی تھی؟

اس کے بعد شیخ قرضاوی سے کئی بار ملاقات ہوئی، زیادہ تر الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین کی تاسیس اور جلسوں میں، استنبول (ترکی) میں بھی اور قطر میں بھی، ہر بار ان کی حمیت دینی کی قوت کا اثر دل پر بڑھتا ہی گیا، آخری ملاقات میں حکومت قطر کی دعوت پر غیر عربی دان مسلمانوں کیلئے خصوصی پروگرام دوحہ میں رکھا گیا تھا، اور اس کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس حقیر کو بھی دعوت دی گئی، میں حاضر ہوا تو اس پروگرام میں بہت سے عرب دوستوں سے ملاقات ہوئی، ہندوپاک کے سربرآوردہ شخصیتوں سے بھی نیاز حاصل ہوا، کئی احباب نے مسلسلا ت کی اجازت حاصل کی؛ لیکن اس ملاقات کا سب سے خوش گوار پہلو جو میرے سفر کے مقاصد میں شامل تھا، یہ تھا کہ شیخ قرضاوی سے تفصیلی ملاقات ہوئی، ان کے گھر پر دعوت ہوئی، انہوں نے اپنی تصنیفات پیش کیں اور ہدیے بھی، میں نے اپنی حقیر تالیف ''نوازل فقہیہ معاصرہ'' پیش کرنے کی سعادت حاصل کی، انہوں نے مختلف جگہ سے دیکھا اور بڑی حوصلہ افزائی فرمائی، شیخ اس وقت کافی کمزور ہو چکے تھے؛ لیکن پھر بھی ہوش وشعور میں کوئی فرق نہیں تھا، ہندوستان کے مختلف اداروں کے بارے میں خاص کر دیوبند، ندوہ، اسلامک فقہ اکیڈمی کے بارے میں پوچھتے رہے، وہ اپنی جیب خاص سے اکیڈمی کا تعاون فرماتے تھے اور اس کی خدمات کو بہت سراہتے تھے۔

آخر مورخہ ۳۰ر صفر ۱۴۴۴ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۲۰۲۲ء کو ایمان وعمل، دعوت وجہاد اور عزیمت واستقامت کا یہ چراغ گل ہوگیا، اور اب پورے عالم اسلام خاص کر عالم عرب میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

• • •

مردم شماری: تاریخ اور اہمیت

سید مقصود ظہیر آبادی
(سکریٹری، بام سیف تلنگانہ)

علم کی طاقت

جانکاری ڈھال بھی ہے تلوار بھی، جس سے دفع اور حملے کا کام لیا جا سکتا ہے، مردم شماری سے کسی ملک میں بسنے والوں کے تعلق سے مختلف پہلوؤں کی معلومات حاصل کی جاتی ہیں، جس میں صرف سروں کی گنتی ہی نہیں ہوتی؛ بلکہ اُن کی سماجی حیثیت اور معاشی حالت، تعلیمی قابلیت، ملک کے اقتدار میں حصہ داری، ملکی وسائل پر دسترس، مذہب، زبان، علاقہ، ذات، برادری، ورن سب کا احاطہ کرتی ہے، انگریزوں کے دور میں سب سے پہلے ۱۸۷۲ء میں مردم شماری کی گئی، کوئی بارہ سوالات پوچھے گئے، سب سے زیادہ ۲۹/سوالات ۲۰۱۱ء کی مردم شماری میں پوچھے گئے، یعنی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے معلومات حاصل کی گئیں، یہ معلومات اصل میں درپن ہوتا ہے سماج کا، جانکاری ڈاٹا سے حاصل ہوتی ہے، اس جانکاری کا استعمال گیان کہلاتا ہے، مردم شماری سے جانکاری، جانکاری سے گیان، اس گیان کا استعمال ہر کوئی اپنے مقصد کے لیے کرتا ہے، حکومتیں پالیسی بنانے میں، سماجی تنظیمیں سماجی تحریکیں تحریک چلانے کے لیے، سیاسی جماعتیں اپنا منی فیسٹو بنانے میں اس ڈاٹا کا استعمال کرتی ہیں، تجارتی ادارے اپنی تجارت کو بڑھانے میں جیسے کاسموٹک صنعت کاروں نے بھارت میں سرمایہ کاری کی، تو بھارت کی کئی حسیناؤں کو عالمی ملکہ حسن منتخب کیا گیا، ۱۹۸۶ء سے ۲۰۰۰ء تک ۵/حسیناؤں نے بھارت سے عالمی ملکہ حسن کا خطاب جیتا۔

انگریز اور ہندوستانی سماج میں ذات پات

انگریزوں نے بھارت پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کے سماج کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی، ۱۷۸۶ء میں ولیم جونس WilliamJones نے منوسمرتی کا انگریزی ترجمہ کیا، میکس ملر نے ویدوں کا ترجمہ کیا،

اتنا ہی نہیں بلکہ اور بہت سے کام انجام دیئے، یہاں کی زبانیں سکھیں، یہاں کے سماج کو سمجھنے کی کوشش کی ،ہندی ادب کو انگریزی زبان میں منتقل کیا، ۱۸۵۷ء کا غدر انگریزوں کے لیے ایک تازیانہ تھا، ملکہ ایلزبتھ نے کمپنی کی حکومت ختم کر دی، اور بھارت تاج برطانیہ کے زیرنگوں آگیا، اس کے بعد انداز حکمرانی میں بڑی تبدیلی لائی گئی، کئی مراعات دی گئیں، یہی سلسلہ چلتا رہا، لارڈ مائیو (فروری ۱۸۴۲ء تا ۸ار فروری ۱۸۷۲ء) نے تنظیمی امور میں تبدیلیاں کیں، انھوں نے ہی مردم شماری کی بنیاد ڈالی، ابھی رپورٹ نہیں آئی تھی کہ کالے پانی کی جیل میں ایک سزا یافتہ قیدی شیر علی آفندی نے معائنہ کے دوران ان کا قتل کر دیا، انگریزوں کے دور میں ہر دس سال بعد مردم شماری کی جاتی رہی، لارڈ مائیو کی ڈالی ہوئی روایت آزادی کے بعد بھی قائم رہی، آزادی سے پہلے ۱۸۷۲ء سے ۱۹۴۲ء تک ۸ر بار مردم شماری ہوئی، اور آزادی کے بعد ۱۹۵۱ء سے ۲۰۱۱ء تک ۷ر بار، اب جو مردم شماری ہوگی، وہ ۱۶ر ویں مردم شماری ہوگی۔

مردم شماری آزادی سے پہلے اور بعد

مردم شماری کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دیکھنا چاہیے، (۱) آزادی سے پہلے (۲) آزادی کے بعد، آزادی سے پہلے جو ۸ر بار مردم شماری ہوئی، وہ ذات پات کی بنیاد پر ہوئی، اور ہر ذات کی الگ سے گنتی کی گئی، انگریز یہ جان گئے تھے، بھارت کرتی پردھان دیش (زراعت پیشہ ملک) سے زیادہ جاتی پردھان دیش (ذات پات کی بنیاد پر بٹا ہوا دیش) ہے؛ اس لیے ہر مردم شماری میں ذاتوں کو گنا گیا؛ مگر آزادی کے بعد ۷ر بار مردم شماری ہوئی، وہ ذات پات کی بنیاد پر نہیں ہوئی، اس سے کس کو فائدہ اور کس کو نقصان پہنچ رہا ہے اور سماج پر کیا اثرات پڑ رہے ہیں، یہ جاننے کی کوشش کریں گے۔

بھارت اور ورن نظام

بھارت دیش کا سماج ورن ویوستھا پر قائم ہے، ورن ویوستھا کی وجہ سے ۴ر طبقے ہیں، اس کے نتیجے میں برادریاں بنیں، ذاتیں بنیں، اس نظام سے اوپر کے تین طبقوں کا تعلق اپنے آپ کو اعلیٰ طبقہ مجھنے والوں نے تعلیم، راج پاٹ، دولت، اپنے حصے میں کر لی اور چوتھے ورن کو شودر کہا، شودر کا کام ان تینوں ورن والوں کی خدمت کرنا قرار دیا گیا، اور ان شودروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، ایک چھونے کے لائق (پسماندہ طبقات) دوسرے اچھوت، جن کو چھوا نہیں جاسکتا (ایس سی، ایس ٹی سی) ان کا مقام جنگل میں یا گاؤں کے باہر ہے، اس غلامی کو مذہبی رنگ دے کر کہا گیا یہ خدائی نظام ہے، اس نظام کا خالق، خالق کائنات ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے، کس کو کس

ورن میں پیدا کرنا، اور انہیں اُس ورن میں پیدا کر دیتا ہے، جس طرح جانوروں کو سدھایا جاتا ہے، اسی طرح شودروں کو بھی سدھایا گیا، اور اُنہیں یہ یقین دلوایا گیا کہ جو غلامی ان پر لا دی گئی ہے، وہ خدا کا انعام ہے، اس لیے اس کو خوشی سے راضی بہ رضا انجام دیتے رہنا چاہیے، کوئی تین ہزار سالوں سے یہ نظام چل رہا ہے، مختلف تحریکوں کی وجہ سے یہ نظام کمزور ضرور ہوا ہے؛ لیکن ختم نہیں ہوا، اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے ہر دور میں طریقہ کار میں تبدیلی ہوتی رہی؛ مگر مقصد کبھی بدیل نہیں ہوا، ذات کی بنیاد پر گنتی نہ کرنا بھی اُسی چال کا حصہ ہے، اس سے فائدے اور نقصانات کے بارے میں اعداد و شمار معلوم ہوں گے، ایک بڑا وبال پیدا ہوسکتا ہے۔

شودر کو ہندو دھرم میں ضم کرنے کی سازش

شودر جو آبادی کا ۸۵ ؍فیصد ہیں ان کو مختلف دور میں اُن کے آقاؤں نے مختلف نام دیئے، جیسے دانو، دیسو، شودر، راکشش، گاندھی جی نے ان کو ہریجن کہا، آج کے دور میں دلت، مول نواسی، بہوجن کے نام سے پہچانے جاتے ہیں، اُن پر راج کرنے کے لیے اُن کی پہچان بدلنا ضروری تھا، آج کے دور میں اُن کو ایک نئی پہچان ’’ہندو‘‘ دی گئی، جب آریہ سماج ۱۸۷۵ء میں قائم ہوئی، اُس کے بانی دیانند سرسوتی نے روز اول سے ہی اپنے آپ کو ہندو کے بجائے دیدکاس کہلانے پر زور دیا، اور کہا:

ہندو مسلمانوں کی دی ہوئی گالی ہے جو ہمیں منظور نہیں۔

دلتوں کیلئے علیحدہ حلقہ انتخاب اور مسلمانوں کی مدد

چنانچہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں آریہ سماج کو قائم ہوئے ۱۶ ؍سال گزرے تھے، (J.H .Hutton P.78the nature) انہوں نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ ان کو ہندوؤں میں شامل نہ کیا جائے، سرائیڈ اور ڈبلنٹ جو مردم شماری کا رجسٹرار تھا، اُس کے حوالے سے لکھتا ہے، ۱۹۱۱ء میں ہم نے آریہ سماجیوں کو ہندو کے بجائے ہندو آریہ لکھا، اب یہ ویدکاس سے ہندو آریہ ہو گئے، ۱۹۳۱ء کی مردم شماری آتے آتے ہندو ہو گئے۔

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو سر آغا خان کی قیادت میں ۳۶ ؍اراکین پر مشتمل ایک وفد نے لارڈ منٹو کے پاس سپاس نامہ پیش کیا، جس میں کوئی ۱۷ ؍مطالبات تھے، اُس میں پانچواں مطالبہ اس طرح تھا:

> ’’غیر مہذب، وحشی، مظاہر پرست، قبائل اور دیگر چھوٹے غیر اہم مذاہب کے ماننے والوں کو خارج کر دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ، اُن تمام طبقوں کو بھی خارج کر دیا جائے جن کا اندارج تو ہندوؤں کی حیثیت سے کیا گیا ہے، جو دراصل ہندو نہیں ہیں‘‘ (بحوالہ ہندوستانی سیاست میں

مسلمانوں کا عروج، ڈاکٹر رفیق زکریا ص:528)

انگریزوں نے ان کے مطالبہ کو مان کر اُن کی گنتی الگ کروائی، جیسے قبائیلوں کا ایک دھرم ''سرنا''، مہاراشٹرا میں ''وارکری''، کرناٹک میں ''لنگایت'' ہندی بلٹ میں ''کبیر پنتھی''، ''روی داسی'' وغیرہ گروہوں کو اُن کی پہچان ہندو دھرم سے الگ دی گئی، بابا صاحب امبیڈکر نے گول میز کانفرس میں ان ہی اعداد شمار کو بنیاد بنا کر اپنے لوگوں کے لیے ریزرویشن کا مطالبہ کیا اور مسلمانوں کا شکریہ ادا کیا کہ اُن کی باشعور قیادت نے ان کی الگ پہچان کروانے میں مدد کی۔

ذات کی بنیاد پر مردم شماری کی تاریخ

1931ء تک مردم شماری مذہب، ذات پات کی بنیاد پر ہوتی رہی، ایک اہم بات نوٹ کرنے والی یہ ہے کہ ۱۹۱۸ء میں برطانیہ میں بالغ رائے دہی کے لیے تحریک شروع ہوئی، اُس وقت برہمن ایک دم چونک گئے اور انھوں نے سوچا ہم انگریزوں کے غلام ہیں، اگر یہ تحریک برطانیہ میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہاں کے ہر شہری کو بلا مذہب و ذات کی تفریق کے ووٹ کا حق ملے گا، بلا ناجس سے ہماری عددی قوت کم ہو جائے گی، کیونکہ اُن کی آبادی ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق پانچ لاکھ پچاسی ہزار ۴۳۴ تھی Censex on India) جو انڈیا کی مجموعی آبادی کا صرف ۳رفیصد ہوتے ہیں، اس طرح ہمارا اقتدار خطرے میں پڑ جائے گا؛ اس لیے انہوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے علاوہ سب کو ہندو کے نام پر متحد کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

دلتوں کو ہندو دھرم میں ضم کرنے کی تحریکیں

آریہ سماج جیسی تنظیم جو اپنے آپ کو ماڈرن ویدک دھرم کی نمائندگی کرنے کا دعوی کرتی تھی، وہ بھی خاموش ہوگئی، اس کے بعد ہندو کے نام پر تنظیمیں بنا شروع ہوئیں، ۱۹۲۳ء میں ہندو مہا سبھا، ۱۹۲۵ء میں آر ایس ایس نے لفظ ہندو کا پرچار زور وشور سے کرنا شروع کر دیا، ہندو کلچر، ہندو سنسکرتی، ہندو جاتی، ہندوؤں کے غلبہ کی باتیں ہونے لگیں، انگریزوں کے ابتدائی دور میں برہمنوں نے اپنی تنظیموں کا نام برہمو سماج، آریہ سماج، وغیرہ رکھا، ان کا مقصد سب کو ہندو بنانا اور ہندو بنا کر ان کو غلام بنائے رکھا اور اُن کے واجبی حقوق سے محروم رکھنا تھا، اب تک شودروں کو ذاتوں میں تقسیم کر کے راج کیا اور آج کے دور میں ہندو کے نام پر انہیں متحد کر کے راج کر رہے ہیں، آج بھی برہمن ملک کے جملہ وسائل پر بلا شرکت غیر قابض ہیں، اس کھیل میں جہاں کانگریس شامل تھی وہیں جن سنگھ اور بی جے پی بھی برابر کی شریک ہے، یعنی سب کا مشترکہ ایجنڈہ برہمنوں کا اقتدار

قائم کرنا ہے ہندو کے نام پر، یہ ایک مذہبی وجہ ہے ذات پات کی بنیاد پر مردم شماری کو روکنے کی، تاکہ اُن کو غلامی کا احساس نہ ہو جائے، اور نہ ان کو اپنی عددی قوت کا احساس ہو، اگر ان کو اس بات کا احساس ہو جائے تو جمہوری نظام میں عددی قوت طاقت اور اقتدار کا منبع ہوتی ہے۔

برہمنی نظام کو چیلنج کرنے والی تحریکوں کے خاتمہ کی کوشش

آزادی سے پہلے سارے ملک میں بہت ساری تحریکیں چل رہی تھی، جو برہمنی نظام کو چیلنج کرنے والی تھیں، جوتی با پھولے (پونہ) پری یار راماسوامی، (تاملناڈو)، نارائین گرو (کیرالہ نیو) شودر تحریک (بنگال) میں تھی، ان کا ایک ہی پروگرام تھا، کچھ بھی بن جاؤ؛ مگر ہندو نہ رہنا، آدی ہندو، آدی دراوڑی تحریکیں، ریاست میسور، آندھرا اور تلنگانہ میں بی شام سندر کی بھیم سینا، آل انڈیا میں بابا صاحب امبیڈکر کی تحریک، بی بی موریا، ندی باٹ میں، پنجاب میں چھوٹ رام کی یونینسٹ پارٹی، جس کا نعرہ تھا ”جاٹو مسلم بھائی بھائی، ہندو قوم کہاں سے آئی“، یہ سب تحریکیں برہمن واد کے لیے خطرہ تھیں، اس خطرے سے نمٹنے کے لیے ہندو مسلم کی تفریق شروع کی گئی اور نفرت کے بیج بوئے گئے، دو قومی نظریہ، ایک قومی نظریہ میں سماج کو تقسیم کیا گیا، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان منافرت پھیلا کر اُن کو ہندو بنایا جائے، آپ کو جان کر تعجب ہوگا، 15 جون 1947 کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ دہلی میں گاندھی کی صدارت میں ہوئی تقسیم ملک کے مسئلے پر قرارداد پیش کی گئی، 15 کے مقابلے میں 157 کی عددی اکثریت سے قرارداد منظور ہوئی، اس طرح ملک کی تقسیم کا راستہ صاف ہوگیا، دوسری طرف دیش بھکتی کے نام پر ہندو مسلم کے نام پر، برہمن واد کے لیے اقتدار پر جمے رہنے کا مستقل انتظام ہوگیا، جو کھیل کانگریس نے کھیلا تھا، آج وہی کھیل بی جے پی کھیل رہی ہے، اور کامیابی پر کامیابی حاصل کر رہی ہے مول نواسیوں کی غلامی کی زنجیریں مضبوط سے مضبوط ہوتی جا رہی ہیں، غیر ہندوؤں کو ہندو بنائے رکھنے کے لیے ذات پات کی گنتی نہیں کروانا چاہتے، جب بھی شودروں، اتی شودروں کو کچھ حقوق ملنے کے آثار نظر آتے ہیں، فوری اعلیٰ ذات والے حرکت میں آجاتے ہیں۔

منٹو مارلے اصلاحات سے شودروں کو فائدہ

1909ء میں منٹو مارلے اصلاحات سے شودروں کو کچھ حقوق ملنے شروع ہوئے، اُس وقت بال گنگا دھر تلک نے 11 نومبر 1917ء کو اتھانی، کرناٹک میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

تیلی تمبولی، کن بھاٹوں کو (مراہٹوں کو) کیا کونسل میں جا کر ہل چلانا ہے، یا ترازو لے کر تولنا ہے۔

یہ الفاظ تھے تلک کے، ۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۹ء میں South Brogh commission یہ جاننے کے لیے بنایا گیا تھا کہ بھارتیوں کو منٹو مارلے اصلاحات سے کتنا فائدہ ہوا، اور اُن کو کیا دیا جائے جس سے ان کو مزید فائدہ ہو، اسی رپورٹ کی بنیاد پر first India Act ایکٹ ۱۹۱۹ء میں بنا، پھر ۱۰/سال بعد ۱۹۲۸ء سائمن کمیشن آیا تو اُس کی بھی مخالفت گاندھی اور اُن کی کانگریس نے کی، سائمن کمیشن سفارشات کی بنیاد پر ۱۹۳۵ میں 2nd India Act بنا، گاندھی اور کانگریس نے محسوس کیا کہ ورن ویوستھا میں داخل اندازی ہو رہی ہے، کیونکہ غلامی نام ہے حقوق سے محرومی کا، اس ایکٹ سے شودروں اور اتی شودروں کو کچھ حقوق ملنے شروع ہو گئے تھے، گاندھی جی چھوا چھات کے مخالف ضرور تھے؛ مگر ورن ودستھا کو قائم رکھنا چاہتے تھے، کیونکہ گاندھی تلک کے نظریاتی وارث تھے۔

شودروں کا جائز حق اور مہاتما گاندھی

مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۰ء میں تلک کے انتقال کے بعد اُن کی وراثت کو سنبھالا ، وہ زندگی بھر مہاتما بھی بنے رہے اور شودروں کو اتی شودروں کو اُن کے حقوق سے محروم رکھنے کے لیے انتھک کوشش بھی کرتے رہے، ۱۹۳۲ء میں جب گول میز کانفرنس کے نتیجے میں انگریزوں نے کمیونل ایورڈ دینے کا اعلان کیا، بابا صاحب امبیڈکر کو مسلم لیگ کے قائدین کی تائید حاصل تھی، جس کی وجہ سے اُن کے چار اہم مطالبات مان لیے گئے۔

(۱) بالغ رائے دہی۔

(۲) دوہری رائے دہی۔

(3) مخصوص انتخابی حلقے۔

(۴) ریزرویشن۔

کمیونل ایورڈ کی وجہ سے جو حقوق حاصل ہوئے تھے اُن کو روکنے کے لیے گاندھی جی نے ایروڈا جیل بھوک ہڑتال میں شروع کر دیا، ۱۹/ویں دن گاندھی جی کی حالت دگرگوں ہوگئی، اور امبیڈکر پر دباؤ بڑھنے لگا، مجبوراً امبیڈکر نے گاندھی سے معاہدہ کر لیا، جس کو تاریخ میں پونہ پیکٹ کے نام سے جانا جاتا ہے، انگریزوں سے لڑ کر مسلمانوں کی مدد کی وجہ سے جو حقوق حاصل ہوئے تھے، وہ پونا پیکٹ کی وجہ سے ختم ہو گئے، پونا کی پینہ بھومی ایروڈا جیل میں یہ کام انجام پایا، اُس کے برے اثرات حقیقی قیادت سے محرومی کی شکل میں دلت آج تک بھگت

رہے ہیں۔

حسب روایت ۱۹۳۱ء میں مردم شماری ہوئی، اس میں جملہ ۲۹ر سوالات پوچھے گئے، ۱۶ر سوالات ۱۹۲۱ء کے ہی تھے، ایک سوال نوکریوں اور آمدنی کے بارے میں، دوسرا مادری زبان اور دوسری زبان کے بارے میں تھا، ذات پات کی بنیاد پر ہونے والی یہ آخری مردم شماری تھی، ایک چونکا دینے والی خبر یہ ہے مسلمانوں میں تقریباً ۵۰۰ر ذات اور برادریوں کی نشاندہی کی گئی، اور عیسائیوں میں ۳۰۰ر، اسلام اور مسلمان بھی ذات پات سے کتنے متاثر ہوئے، اس سے اندازہ لگتا ہے اور مسلمان اشرف اور ارذل میں تقسیم ہوئے، اس مسئلہ پر ہر جماعت اور مسلمان تنظیموں کو کام کرنے کی ضرورت ہے، مسلمانوں کی ۸۵ر فیصد آبادی او بی سی سے تعلق رکھتی ہے، اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں مردم شماری ہوئی؛ مگر اس کو شائع نہیں کیا گیا، ایک وجہ یہ بتائی گئی دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے کام درست انداز میں انجام نہ پاسکا۔

ذات پات پر مردم شماری کا خاتمہ

دوسری وجہ ۱۹۳۷ء میں Prevetial گورنمنٹ کے لیے الیکشن کروائے گئے، ۱۲ر حلقوں میں سے ۸ر میں کانگریس کی حکومت تھی، کچھ حالات کی وجہ سے اور کچھ نیت کا کھوٹ تھا، اس کام کو درست انداز میں انجام پا نہ سکا، اس لیے اس مردم شماری کے اعداد وشمار ظاہر نہیں کیے گئے، ۱۹۵۱ء میں مردم شماری ہوئی، حالات تبدیل ہو چکے تھے، ملک آزاد ہو کر صرف ۵ر سال گذرے تھے، آزادی کے بعد یہ پہلی مردم شماری تھی اور آزادی سے پہلے ۷ر بار مردم شماری ہو چکی تھی، اس مردم شماری کی خاص بات یہ تھی کہ ذاتوں کی بنیاد پر اعداد وشمار جمع کرنے کا کام قانون بنا کر بند کر دیا گیا، ایسا نہرو سرکار نے ایکٹ 37-Sensux Act1948 ایکٹ بنا کر کیا، مردم شماری کے لیے دو سے تین سال پہلے سے ہی تیاری شروع کرنی پڑتی ہے، اس لیے امبیڈکر نے پارلیمنٹ میں اس مسئلہ پر دو مرتبہ توجہ دلائی، ۱۹۵۲ء میں آزادی کے بعد پہلا الیکشن ہونے والا تھا، اُس سے پہلے ۱۹۵۱ء میں مردم شماری کروائی جائے تو جمہوریت کے لیے بہتر ہوگا، بات سنی ان سنی کر دی گئی؛ مگر ذات پات کی بنیاد پر گنتی ختم کرنے کا اعلان کیا، مذہب کی بنیاد پر گنتی ہوئی، ۱۹۵۱ء میں مردم شماری میں تقریباً ۱۴ر سوالات پوچھے گئے، یہ سب تقریباً وہی سوالات تھے جو سابقہ میں پوچھے گئے تھے؛ مگر ایس ٹی ایس سی کو چھوڑ کر ذات پات کی گنتی بند کر دی گئی، اس کی وجہ پنڈت نہرو نے یہ بیان کی:

ہم آزاد ہو گئے ہیں، ہمارے دیش کو ماڈرن دیش بنانا ہے، ہم اور زیادہ دنوں تک ذات پات

کے دلدل میں پھنسے نہیں رہ سکتے ،ذات پات کی بنیاد پر مردم شماری سے جاتی واد بڑھے گا۔

بات یہاں تک درست تھی تو مذہب کی بنیاد پر اور ایس سی ،ایس ٹی کی ذات کی بنیاد پر گنتی کیوں کی گئی، کیااس سے مذہبی منافرت نہیں پھیلے گی ،ان کا مقصد ہی مذہبی منافرت پھیلانا تھا، تاکہ غیر ہندوؤں کو ہندوؤں میں شامل کرا اپنی عددی قوت بڑھا کر ہندوؤں کے نام پر برہمن راج قائم کیا جاسکے، ۱۹۵۱ء کی مردم شماری ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہندو ۸۴ فیصد ،مسلمان ۹ فیصد، عیسائی ۲ رفیصد، سکھ پونے دو فیصد، بدھسٹ پونے ایک فیصد، جین صفر اعشاریہ ۵۰ فیصد، آزادی سے پہلے ہندوؤں کی آبادی ۷۳ رفیصد تھی ، آزادی اور ملک کی تقسیم نے ہندوؤں ۸۴ رفیصد بنادیا، مسلم اکثریت آبادی والے علاقے بھارت سے کاٹ دیئے گئے تھے، ۱۹۴۷ء تک غلام بھارت میں جو مذاہب آزاد تھے، جیسے لنگایت، سرنادھرم، دارکاری، کبیر پنتھی، قبائل وغیرہ سب ہندوؤں میں شامل کیے گئے، اس طرح اُن کی آزادی برہمنوں کی غلامی میں تبدیل ہوگئی۔

لنگایتوں کی علیحدہ مذہبی شناخت کی تحریک

ریاست کرناٹک میں لنگایت مذہب والوں کو اپنی غلامی کا احساس ہوا تو 2018ء انہوں نے میں بہت بڑی تحریک چلائی اس بات پر کہ لنگایت مذہب کو ہندو دھرم میں شامل نہ کیا جائے اور اُن کو الگ مذہب کی حیثیت سے پہچان ملے، غلام بھارت میں ہماری پہچان آزاد مذہب کی تھی اور آزاد بھارت میں ہم غلام ہو گئے ہیں، ہماری سابقہ پہچان کو بحال کیا جائے، عوامی تحریک کے مقابلے میں سدارامیا کی سرکار کو جھکنا پڑا، اور اسمبلی سے قرارداد منظور کر کے مرکزی حکومت کو روانہ کر دیا گیا، ایسا ہی معاملہ قبائل سے تعلق سے رکھنے والے، مظاہر کی پرستش کرنے والے سرنادھرم کا بھی ہے، جھارکھنڈ، بہار اور چھوٹا ناگپور کے علاقوں میں احتجاج درج کروایا گیا، اُن کا نعرہ ہے ''مذہب کا کوڈ نہیں، تو مردم شماری بھی نہیں''، ہندو دھرم کی ایک بڑی کمزوری ہے اُس میں داخلے کا کوئی راستہ نہیں، باہر نکلنے کے ہزار راستے کھلتے ہوئے ہیں، کیونکہ یہ نسل کی بنیاد پر چلنے والے نظریہ ورن ویوستھا پر قائم ہے، یہ اپنے مخالف کو ضم کر کے ہضم کر دیتے ہیں، بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کے بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے:

> برہمن بدھ کو ۹ رواں اوتار مانتے ہیں ؛ لیکن اس مذہب کو قبول نہیں کرتے ، (بحوالہ: ہندو دھرم اکبر کے عہد میں، از: ابوالفضل، ترجمہ فدا علی ص: 183، خدا بخش اورنٹیل لائبریری پٹنہ)

اس طرح ذاتوں کو، مذاہب کو ہضم کرنے کے لیے جو حربے استعمال کیے جاتے ہیں اُن میں فی زمانہ ذات پات کی بنیاد پر مردم شماری کو روکنا ہے، ویدک دھرم کے ماننے والے یہ کھیل روز اول سے آج تک کھیل

رہے ہیں۔

۱۹۶۱ء میں مردم شماری ہوئی، نہرو کی کانگریسی برہمن وادی سرکار نے ذات کی بنیاد پر مردم شماری نہیں کروائی؛ کیونکہ ۱۹۴۸ء میں ہی قانون بنا کر روک لگا چکے تھے، ۱۹۶۱ء میں وزیراعظم رہتے ہوئے کیسے کروا سکتے تھے، ۱۹۷۱ء میں مردم شماری کروانے کا وقت آیا، وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی جو اپنے باپ کی پکی بیٹی تھی انھوں نے بھی نہیں کروائی، اور اپنے باپ کے بنائے قانون کو باقی رکھا، ۲۴/مارچ ۱۹۷۷ سے ۱۵/جولائی ۱۹۷۹ء تک جنتا پارٹی کی گورنمنٹ مرارجی دیسائی کی قیادت میں ۱۸/مہینوں تک چلتی رہی، نہرو کے زمانے میں کا کا کالیر کر کمیشن بنایا گیا، اُن کی سفارشات کو لاگو کرنے کا مطالبہ زور پکڑا، مراجی دیسائی گجراتی برہمن، گاندھی وادی، کانگریسی رہنما، وہ بھلا اس کام کو کیسے انجام دے سکتے تھے، انھوں نے ایک چال چلی، بات کو ٹالنے کے لیے منڈل کمیشن کا قیام عمل میں لایا گیا، منڈل کمیشن کی رپورٹ آنے سے پہلے ہی سرکار چلی گئی، اور اندرا گاندھی اقتدار میں آ گئی، ۱۹۸۱ء میں مردم شماری ہوئی، اندرا گاندھی ۱۴/جنوری ۱۹۸۰ء سے ۳۱/اکتوبر ۱۹۸۴ء تک وزیراعظم رہیں، اس دوران مردم شماری ہوئی، مگر اسی پرانی لکیر کے تحت جو اُن کے باپ پنڈت نہرو نے قائم کی تھی، اس طرح معاملہ جہاں کا وہیں رہا۔

۱۹۹۱ء میں مردم شماری ہوئی، مگر اُس سے پہلے حالات ایسے بنے کہ وی پی سنگھ کی سرکار جو ۲/دسمبر ۱۹۸۹ء سے ۱۰/نومبر ۱۹۹۰ء تک چلی، وی پی سنگھ نے او بی سی کے لیے منڈل کمیشن کی کچھ سفارشات نافذ کیا، اُن کی حکومت چلی گئی، بی جے پی کی مدد سے چل رہی سرکار نے پسماندہ طبقات کو تحفظات کے ذریعہ اختیارات دینے کی کوشش کی، پسماندہ طبقات جو بی جے پی کی بنیاد اور اہم ووٹرس ہیں، اُن کو ہی اختیارات سے محروم رکھنے کے لیے بابری مسجد، رام جنم بھومی کی تحریک شروع کی؛ کیونکہ ملک کے تین فیصد برہمنوں کا انتظامیہ میں ۸۲/فیصد حصہ تھا، اگر منڈل سفارشات درست طریقے سے نافذ ہوتی تو ۸۲/فیصد حصے میں سے ۵۲/فیصد برہمنوں کا ہی جاتا تھا، اس بات کو نظر میں رکھ کر تحریک شروع کی گئی، مسجد گرادی گئی، اور او بی سی کے حقوق اعلیٰ ذات والے ہضم کر گئے۔

دیوے گوڑا اور ذات کی بنیاد پر مردم شماری

۱۰/نومبر ۱۹۹۰ء سے ۱۲/جنوری ۱۹۹۱ء تک چندر شیکھر کی سرکار کانگریس کی مدد سے چل رہی تھی، اُس نے بھی ذات پات کی بنیاد پر مردم شماری نہیں کروائی، ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے وقت واجپائی وزیراعظم تھے،

انھوں نے بھی ذات پات کی بنیاد پر مردم شماری نہیں کروائی ،ایک بات بڑی دلچسپ اور برہمن وادی سوچ جو بلا تفریق پارٹی ، کانگریس ، بی جے پی اور کمیونسٹ میں پائی جاتی ہے، اس لیے ایس ٹی،ایس سی،او بی سی کے لیڈر کانشی رام جی اُن کو برہمن وادی اے ٹیم کانگریس، بی ٹیم بی جے پی اورسی ٹیم کمیونسٹ کہتے تھے،اس بات کو خاص طور پراو بی سی اوراقلیتوں کوسوچنا چاہیے،اوراس کا بھی احساس کرنا چاہئے کہ برہمن وادی پارٹیاں ذات پات کی بنیاد گنتی نہ کرانے کے تعلق سے کتنی چوکس رہتی ہیں،اس کی مثال یہ ہے کہ ۱۹۹۶ءمیں صرف ۱۶ر دن کے لیے واجپائی وزیر اعظم بنے ، اُن سولہ دنوں میں ان کی کابینہ نے ۸ راہم فیصلے کیے،اُن میں سے ایک یہ بھی تھا، ۲۰۰۱ءمیں جو مردم شماری ہوگی، وہ ذات پات کی بنیاد پرنہیں ہوگی، ہنگامی حالات میں بھی اس مسئلہ پر ان کی چوکسی کی داد دینی چاہیے،اُس کے بعد ایچ ڈی دیوے گوڑا وزیر اعظم بنے،دکن کے غیر برہمن ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنی کابنیہ میں کسی ایک برہمن کو نہیں لیا، بھارت میں پہلی بار ایسا ہوا کہ بغیر برہمن وزیروں کے سرکار بنی۔

ایک اہم بات دیوا گوڑا کی یہ تھی کہ انھوں نے کابینہ میں یہ پاس کروایا کہ ۲۰۰۱ءکی مردم شماری ذات پات کی بنیاد پر ہوگی ،مردم شماری کی تیاری تین سال پہلے سے ہی کرنی پڑتی ہے،پالیسی سوالنامہ طئے کرنا پڑتا ہے، دیوا گوڑا کی سرکار ۲۱ راپریل ۱۹۹۷ءکو گرادی گئی،اس کے بعد آئی کے گجرال وزیر اعظم بنے، ۳۳۲ر دن سرکار چلی، حالات بدل گئے،اٹل بہاری واجپائی پھر واپس آئے اور ۵ رسال تک حکومت چلاتے رہے، بھارت میں جب بھی غیر برہمن وزیر اعظم بنتا ہو،اس کو ۵ رسال تک حکومت کرنے نہیں دیا گیا،اکثریت کم بھی ہو،تب بھی نرسمہا راؤ کی سرکار ۱۵ رسال تک چلتی رہی، ۲۰۰۱ءمیں مردم شماری ہوئی،مگر ذات پات کی بنیاد پر نہیں۔

کانگریس اور ذاتوں کی مردم شماری

۲۰۱۱ءمردم شماری کی تاریخ میں ایک اہم موڑ آیا تھا،سبھی کو ایسی اُمید جاگی تھی کہ اس بار تو ذات پات کی بنیاد پر گنتی ہوگی؛ کیونکہ ۶ راور ۷ رجون ۲۰۱۰ءکو لوک سبھا میں دو دن کا سیشن رکھا گیا،اس میں مختلف پارٹیوں کے تقریبا ۴۰ رممبران نے حصہ لیا،اُس میں خاص کر لالو پرساد یادو ملائم سنگھ یادو، شردیادو،حکم سنگھ ڈوم،سندیپ ڈکشت،حکم دیو نارائین، دھارا سنگھ چوہان، بی جے پی کے ڈپٹی لیڈر حسب اختلاف جن کا تعلق مہاراشٹرا سے تھا اُنھوں نے کہا:

> اگر ۲۰۱۱ءمیں ذات پات کی بنیاد پر مردم شماری نہیں کرواتے تو او بی سی کو انصاف دلوانے میں اور دس سال لگ جائیں گے،اُن کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

یو پی اے کی سرکار میں سونیا گاندھی کی قیادت میں من موہن سنگھ کی موجودگی میں کیبنٹ میٹنگ ہوئی، اُس کے بعد من موہن سنگھ نے پارلیمنٹ میں بیان دیا،۲۰۱۱ء کی مردم شماری ذات پات کی بنیاد پر ہوگی، سب خوش ہو گئے کہ اس بار تو ذاتوں کی بنیاد پر گنتی ہو گی، یہ اعلان ہوتے ہی ملک بھر کے اعلیٰ ذات والوں نے سارے ملک میں احتجاج شروع کر دیا، جون ۲۰۱۰ء سے اگسٹ تک کے سارے بڑے بڑے اخبار کالم لکھنے لگے، ٹی وی چینلوں پر بحث مباحثہ کروائے گے، یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ ذات پات کی گنتی سے ملک میں ایک وبال کھڑا ہوگا، اور ہماری ایکتا میں خلل پڑے گا، یہ تو میڈیا کا رول تھا، بیوروکریسی نے بھی اپنا فرض خوب نبھایا، چندرموتی جو مردم شماری کے کمشنر تھے، انہوں نے رپورٹ جاری کی کہ ذات پات کی بنیاد پر مردم شماری نہیں کروا سکتے یو پی اے نے اہم فیصلے لینے کے لیے جو جی او ایم بنایا تھا ، اس کی قیادت پرنب مکھر جی کے ہاتھ میں تھی، ایسا سچا بنگالی برہمن جاتی گت گنتی کیسے ہونے دے سکتا تھا۔

من موہن تو پی ایم تھے؛ مگر وہ بھی نریندر مودی کی طرح برہمنوں کے نامزد تھے، اکثر ایسا ہوتا ہے کتابت کی غلطی سے اگر ایک نقطہ چھوٹ جائے تو نامزد بھی نامرد پڑھا جاتا ہے، من موہن گرو کے بندے تھے، مساوات، بھائی چارہ کو ماننے والے گرونانک کے مذہب سے اُن کا تعلق تھا، اُن کی بھی کوئی مجبوری رہی ہوگی، مردم شماری کا کام ہوم منسٹر کے ذریعہ ہوتا ہے، چدمبرم اُس وقت منسٹر تھے، اُنہوں نے بھی ذات پات کی بنیاد پر مردم شماری کی مخالفت کی، سارے لوگوں نے مل کر ذات پات کی گنتی کو ہونے نہیں دیا، یہ پاپ کانگریس نے اپنے سر لیا، یہ طے پایا کہ ۲۰۱۱ء کی مردم شماری میں ذات پات کی گنتی نہیں ہوگی، سطح غربت سے نیچے کا جو سروے ہوگا، اُس کے ساتھ ذات کی گنتی بھی ہوگی، اس کے لیے تین ہزار کروڑ کا بجٹ بھی متعین کر دیا گیا، عمداً ایسے حالات بنائے گئے کہ یہ گنتی درست انداز میں انجام نہ پائے، عام طور پر مردم شماری ۲۸ر دنوں میں مکمل کر لی جاتی ہے؛ مگر اس مردم شماری کے لیے وقت اور تاریخ کا تعین نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے یہ ۵ر سال تک چلتا رہا اور بجٹ بھی بڑھانا پڑا، چار کروڑ آٹھ سوتر یاسی لاکھ خرچ کرنے پڑے، عام طور پر اسکول کے اساتذہ سے یہ کام لیا جاتا رہا، انگن واڑی رضا کاروں، این جی اوز اور پرائیوٹ اداروں کو یہ کام سونپا گیا، من موہن کی سرکار چلی گئی۔

بی جے پی اور ذاتوں کی مردم شماری

رپورٹ نریندر مودی کے زمانے میں باہر آنی تھی نہیں آئی، البتہ اس کو درست کرنے کے لیے ارون گڑھیا کی قیادت میں ایک کمیٹی بنائی گئی؛ مگر حکومت کی تائید نہ ہونے کی وجہ سے ارون گڑھیا یہ کام چھوڑ کر

بیرون ملک چلے گئے، سرکار کانگریس کی ہو یا بی جے پی کی، دونوں غیر برہمنوں کو اقتدار میں حصہ نہ ملنے کیلئے بڑی سمجھ داری اور آپسی تال میل سے کام کرتے ہیں، یہ بات غیر برہمنوں کو سمجھنا چاہیے، پارٹی اور تنظیم الگ بات ہے، کام کیا کر رہی ہے دیکھنا ہوگا، اور مسلمانوں کو سمجھنا ہوگا کہ چاہے سیکولر ہوں یا کمیونسٹ، غیر برہمنوں اور اقلیتوں کے معاملے میں دونوں کمیونل ہیں، اس بات میں کسی کو شک میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب جو مردم شماری ہوگی، وہ بہت اہم ہوگی، ۲۰۱۰ء سے ۲۰۲۰ء تک مردم شماری کے لیے بہت ساری تحریکیں چل رہی ہیں، مختلف پارٹیوں نے اس کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا، جیسے راجناتھ سنگھ، جو ہوم منسٹر تھے، انہوں نے ۲۰۱۸ء میں اعلان کیا تھا ''اگلی مردم شماری میں او بی سی کی گنتی کر دی جائے گی ۲۰۱۹ء کے الیکشن جیت گئے، اور بات بھول گئے، ۲۰۱۷ء میں روہنی کمیشن یہ معلوم کرنے کے لیے بنایا گیا کہ پسماندہ طبقات کو جو ۲۷رفیصد ریزوریشن دیا گیا ہے، پسماندہ طبقات کی ذیلی ذاتوں میں اس کی منصفانہ میں تقسیم نہیں ہوئی، اس کے پیچھے کا مقصد او بی سی کو آپس میں لڑوانا تھا، دینا کچھ نہیں تھا ۲۷رفیصد ریزرویشن کو ۴رحصوں میں تقسیم کیا گیا، ۲۰۳۳ر ذاتوں کی پہچان کی گئی، ۲۹ ذاتوں کو ۱۰رفیصد ریزرویشن، ۳۲۸ر ذاتوں کو ۵۲ فیصد، ۹ر ذاتوں کو ۶رفیصد، ۱۶۷۴ر ذاتوں کو ۲رفیصد ریزرویشن طے کیا گیا، اس کمیشن کی وجہ سے او بی سیز کے اندر لڑائی شروع ہوئی، بی جے پی سرکار جہاں مذہب کے نام پر لڑواتی ہے، وہیں ذات پات کی بنیاد پر تفریق پیدا کرنا برہمنوں کا پرانا کھیل ہے، ضرورت پڑنے پر تفریق کر کے حکومت کرتے ہیں یا متحد کر کے حکومت کرتے ہیں، آج کل ہندو بنام مسلم کر کے ہندوؤں کو ہندو کے نام پر بھی ذات والوں کو متحد کر کے راج کر رہے ہیں، بہوجنوں کو غلام بنانا، اور غلام بنائے رکھنا اُن کا مقصد ہے، طریقہ کار کونسا بھی ہو۔

کرپوری ٹھاکر اور ریزرویشن

دسمبر ۱۹۷۷ء سے اپریل ۱۹۷۹ء میں کرپوری ٹھاکر بہار کے دو مرتبہ چیف منسٹر بنے، انہوں نے بھی ریزرویشن نافذ کیا، نیت صاف تھی، سب کو فائدہ پہنچانا مقصد تھا، انہوں نے ۲۰رفیصد ریزرویشن او بی سیز کے لیے رکھا اور تقسیم اس طرح کی، پچھڑوں کے لیے ۸رفیصد، مزید پچھڑوں کے لیے ۱۲رفیصد، اس میں پسماندہ مسلمانوں کو بھی شامل کیا گیا، جیسے مسلمان دھوبی، مسلمان نائی، مسلمان بنکر وغیرہ، پسماندہ مسلمانوں کی تحریک بہار اور یو پی میں چل رہی تھی، اور ان کا نعرہ تھا: ''دلت مسلم ایک سمان، ہندو ہو کہ مسلمان''، اعلیٰ ذات والوں کو یہ کیسے برداشت ہوسکتا تھا، اُس وقت جس طرح منڈل کے خلاف تحریک چلی، اسی طرح ۱۹۷۹ء میں بہار میں بھی وہ سڑکوں پر اتر

آئے اُن کا نعرہ تھا:

''کرپوری کرپوراچھوڑ گدی اُٹھااسترا''

کیونکہ یہ نائی تھے، اُن کی حکومت گرادی گئی، جن سنگھ اور کانگریس کی تائید سے یہ حکومت چل رہی تھی، تائید واپس لے لی گئی، کرپوری کو اس کی بڑی قیمت چکانی پڑی، مولانا مودودی نے اپنے تاریخی خطبے، خطبہ مدراس میں بالکل صحیح بات کہی ہے:

اعلیٰ ذات والوں کو اللہ تعالی نے سب کچھ دیا ہے؛ مگر وہ وسیع قلب اور وسیع نظر سے محروم ہیں۔

مودی اور ذات کی بنیاد پر مردم شماری

مودی جی اکثر الیکشن کے موقع پر او بی سی ہو جاتے ہیں، او بی سی کو اپنے اندر جال میں پھنسانے کے لیے اپنی کابینہ میں تین مہینے پہلے ۲۶ رعدد او بی سیز کو وزارت دی، مگر ذات پات کی گنتی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، مرکزی ہوم منسٹر نتیہ نند رائے نے ۲۰ رجولائی ۲۰۲۱ء کو لوک سبھا میں بیان دیا کہ '' مرکزی سرکار نے ایس سی رایس ٹی کے علاوہ کسی بھی جاتی کی ذات کی بنیاد پر گنتی کا کوئی حکم نہیں دیا ہے، پچھلی بار کی طرح ایس سی ایس ٹی کے علاوہ کسی کو بھی جاتی کو گنتی میں شامل نہیں کیا جائے گا''، بڑا ٹکنیکل بیان دیا، صرف او بی سیز کی گنتی کی جائے تو او بی سیز کی حالت کا پتہ چلے گا، سبھی کی گنتی کروائی جائے تو اعلیٰ ذات کہلانے والے برہمن کشتریا، ویش مختلف شعبہ زندگی میں کہاں ہیں، اور اُن کے قبضہ میں ملک کے وسائل کتنے ہیں معلوم ہوگا، اس سے مکمل ناانصافی کی تصویر سامنے آئے گی، جس سے شودر سماج میں بیداری پھیلے گی، جس کے نتیجے میں کئی تحریکات پیدا ہوں گی، اور یہی چیز ہے جس کو اعلیٰ ذات والے روکنا چاہتے ہیں، ان کی پوری کوشش ہے کہ نچلی ذاتوں کو جذباتی ایشوز میں پھنسا دیا جائے جس سے وہ اپنے اصل مسائل کو بھول جائیں، اور اسی کے ساتھ اعلیٰ ذات والوں کی کوشش ہے کہ نچلی ذاتوں کی توجہ اپنے استحصال سے ہٹا کر ایک فرضی دشمن کی طرف کر دی جائے تا کہ ان کی ساری طاقت اور صلاحیت اسی فرضی دشمن سے لڑنے میں خرچ ہو اور آج پسماندہ طبقات اور نچلی ذاتوں کیلئے بی جے پی نے مسلمان کو بحیثیت دشمن انتخاب کیا ہے۔

کولہا پور کے راجا شاہو مہاراج نے ۱۹۰۱ء کی مردم شماری دیکھی، اُن کو معلوم ہوا کہ ان کی ریاست میں انتظامیہ میں کس کی کتنی حصہ داری ہے، ۷۲ ر پوسٹ میں ۶۰ ر برہمن، ۵۰۰ ر روپیئے سے کم درجہ کی نوکریوں میں ۴۹۰ ر برہمن، یہ دیکھ کر شاہو مہاراج نے اپنی چھوٹی سی ریاست میں ۵۰ رفیصد تحفظات غیر برہمنوں کے لیے مختص

کر کے اپنے جنم دن ۶ رمئی ۱۹۰۲ءکو اپنی مول نواسی رعایا کے لیے تحفہ کے طور پر دینے کا اعلان کیا، سارے ملک میں بہت ساری تنظیمیں اپنا احتجاج درج کروانے کے لیے مختلف پروگرام کررہی ہیں، راشٹریہ پچھڑا مورچہ کے وکاس چودھری نے بھارت بند کرنے کا اعلان کیا، جس کی تائید بہوجن مکتی پارٹی، بھارت کرانتی مورچہ مسلم راشٹرایہ مورچہ ،سکھ راشٹریہ مورچہ، لنگایت مورچہ کے علاوہ مختلف تنظیمیں اس بند کی تائید کررہی ہیں، جہاں اس کی تائید میں مختلف تنظیمیں احتجاج کررہی ہیں، وہیں بہار، مہاراشٹرا، تاملناڈو، آندھرا پردیش، اوراُڈیشہ کی حکومتوں نے ذات کی بنیاد پر مردم شمار کیلیے ریزولیشن پاس کر کے مرکزی حکومت کے پاس روانہ کردیا ہے، دیکھتے ہیں کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

●●●

فطرت سے بغاوت پر مبنی تمدن

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
(بانی وناظم المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی فقہی خدمات محتاج تعارف نہیں، آپ جہاں ایک مایہ ناز فقیہ ہیں، وہیں اردو کے اچھے ادیب بھی، ادب کی ایک اہم صنف سفرنامہ ہے، سفر کا مقصود قرآن کریم نے عبرت آموزی بتایا ہے، مشرق ومغرب کو آپ نے دیکھا اور چھانا ہے، آپ کے اسفار کا مجموعہ ''متاع سفر کے نام سے شائع ہو چکا ہے، آپ کی دیگر تحریروں کی طرح آپ کے سفرنامے بھی روانی، سلاست اور شگفتہ زبانی اور بیانی کا نمونہ ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ آپ اس کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ سفرنامہ نہ اتنا طویل ہو کہ قاری کو اکتاہٹ ہو اور نہ اتنا مختصر کہ قاری کی تشنگی باقی رہے، معتدل اور متوازن سفرنامے آپ کی شناخت ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے اسفار کو اہل علم اور باذوق قارئین شوق کی آنکھوں سے پڑھتے ہیں اور دامن دل میں جگہ دیتے ہیں، آپ کے سفرنامے کی خاص خصوصیت عبرت ونصیحت کے پہلو کا موثر بیان ہے، آپ کا حال میں ری یونین کا سفر ہوا، جو فرانس کا مقبوضہ علاقہ ہے، اور تہذیبی وتمدنی اعتبار سے مغربی ملکوں کی ہمسری کر رہا ہے، آپ نے اپنے مشاہدات وتاثرات پر مبنی مضمون کو ''فطرت سے بغاوت'' کا نہایت بجا اور مناسب عنوان دیا جو ملک کے مشہور اور کثیر الاشاعت روزنامہ مصنف میں دو قسطوں میں شائع ہوا، بحث ونظر کے قارئین کے افادہ کیلئے اس اہم مضمون کو بھی زیر نظر شمارہ میں شریک اشاعت کیا جا رہا ہے۔

(عبید اختر رحمانی)

براعظم افریقہ کے سمندر میں کئی جزائر ہیں، ان میں ایک ری یونین ہے، دوسرا ماریشش ہے، میں دونوں جزائر میں پہلے بھی جا چکا ہوں، ری یونین فرانس کی کالونی ہے؛ اگر چہ فرانس نے یہاں کے باشندوں کو آزادی کی پیش کش کی تھی؛ لیکن جزیرہ میں رہنے والوں نے فرانس کا حصہ رہنے کو قبول کیا، ماریشش برطانیہ کے زیر قبضہ تھا، اوراس نے آزادی حاصل کرلی، ماریشش میں زیادہ تر ہندوستان نژادلوگ رہتے ہیں؛ اس لئے ہندوستان سے جانے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہی ملک میں ہیں، زیادہ آبادی ہندوؤں کی ہے، اس کے بعد مسلمانوں کی، پھر بدھسٹوں اور عیسائیوں کی ہے،تہذیب بھی بڑی حد تک یہاں سے ملتی جلتی ہے،؛لیکن ری یونین جوفرانس کا حصہ ہے، وہاں کے لوگوں کو یوروپ کی شہریت حاصل ہے؛ اس لئے وہاں کے حالات کافی مختلف ہیں اوران کی پوری ثقافت یوروپ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے، یہاں یوں تو ایشیائی نسل کے لوگ ہیں؛ لیکن غلبہ افریقی نسل کے لوگوں کا ہے، اوران کے ساتھ ساتھ سفید فام لوگ بھی آباد ہیں، مسلمانوں کی تعداد اگر چہ بہت کم ہے؛ لیکن معاشی اعتبار سے وہ اچھی پوزیشن میں ہیں۔

ان دونوں ملکوں میں یوں تو میں پہلے بھی جا چکا ہوں؛ لیکن مولانا محمد زکریا گنگات کی دعوت پر ۱۸ر اپریل ۲۰۲۴ء کو میں براہ ماریشش ری یونین کے لئے روانہ ہوا، یہ جمعرات کا دن تھا، بعد مغرب ہمارا سفر شروع ہوا، اور وقت کے فرق کی وجہ سے جمعہ کے دن جمعہ سے پہلے ہم لوگ ری یونین پہنچ گئے، اس سفر کا خصوصی پروگرام فرنچ زبان میں اسلام پر مولانا انس لالہ صاحب کی کتاب کی اورعربی زبان میں عزیز مکرم مولانا یحییٰ گنگات سلمہ کی کتاب کی رسم اجراء تھی، یہ مغربی ملکوں میں مسلم اقلیت کے شرعی مسائل پر ہے، اور یہ ان کا وہ مقالہ ہے، جوانھوں نے المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے تخصص فی الفقہ سال دوم کے لئے لکھا تھا۔

یوں تو یوروپ کے کئی ملکوں کا سفر کرنے کا موقع ملا ہے اور خود ری یونین بھی ایک سے زیادہ بار جا چکا تھا؛ لیکن اس بار وہاں پندرہ دنوں مسلسل قیام کا موقع ملا، اور میرا خیال ہے کہ اگر یوروپ کے مزاج کو سمجھنا ہو تو اس کو فرانس سے سمجھنا چاہئے؛ کیوں کہ یہیں سے مذہب کے خلاف بغاوت شروع ہوئی، اور آج بھی یہ مذہب بیزاری میں سب سے نمایاں ملک ہے، ان دو ہفتوں میں وہاں متعدد پروگراموں میں شریک ہونے کا اور بہت سارے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا، اور میں نے گہرائی کے ساتھ یوروپ کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی؛ کیوں کہ فرانس ایک فوجی طاقت ہے، چاہے مغرب کی سب سے بڑی طاقت نہ ہو؛ لیکن ثقافتی پہلو سے وہ مغرب کا قبلہ ہے۔

میں نے فرانس کے آئینہ میں پورے یوروپ کی تصویر دیکھی، مجھے یہ دورُخی تصویر نظر آئی، ایک پہلو وہ ہے، جو انسان کو بہت متأثر کرتا ہے، اور اسلام نے جو اخلاقی تعلیمات دی ہیں، اس کا عملی نمونہ نظر آتا ہے، جیسے صفائی ستھرائی، گھر کے اندر اور باہر، سڑک ہو یا بازار، مسجد ہو یا میرج ہال، سمندر کا ساحل ہو یا عوامی مقامات ہوں، ہر جگہ اتنی صفائی ستھرائی کہ انسان چاہے تو وہیں لیٹ جائے، روشنی کا بقدر ضرورت استعمال، ہمارے ملکوں کی طرح روشنی کا سیلاب نہیں، مغرب ہوتے ہی سر شام پوری مارکیٹ بند ہو جاتی ہے اور سوائے کلبوں کے اور میڈیکل اسٹور کے کوئی دوکان کھلی نہیں رہتی، رات دیر تک جاگنے اور ہوٹل بازی کرنے کا عمومی مزاج نہیں ہے، راستہ چلنے والوں بالخصوص بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور بیماروں کا بہت خیال کیا جاتا ہے، چاہے ریڈ سگنل نہ ہو تب بھی گاڑی روک دی جاتی ہے، نو واروں کے ساتھ بھی پورے اخلاق کے ساتھ پیش آیا جاتا ہے، چیخنے چلانے اور زور سے جھگڑنے کی آواز نہیں آتی، خرید وفروخت وغیرہ میں جھوٹ بولنے اور دھوکہ دے کر پیسے حاصل کرنے کا مزاج نہیں ہے، انسان کہیں بھی نکل جائے، اپنے کو مامون اور محفوظ سمجھتا ہے؛ لیکن سر راہ چھیڑنا اور زور زبردستی کرنے کے واقعات کم ہی پیش آتے ہیں، حکومت ٹیکس اتنا ہی لیتی ہے، جتنا ہندوستان میں ہے؛ لیکن وہاں ہر شہری کے لئے مفت علاج، ہر بچہ کے لئے مفت تعلیم اور بے گھر لوگوں کے لئے مکان کا نظم یا کرایہ میں تعاون، بوڑھوں اور مریضوں کے لئے خدمت کا انتظام وغیرہ کی سہولت دی جاتی ہے؛ اس لئے لوگ وہاں کبر سنی کے باجود تنہا زندگی گزارنے پر بھی آمادہ رہتے ہیں۔

انسانی خدمت اور ظاہری اخلاق کے اعتبار سے بہت سی خوبیاں وہاں نظر آتی ہیں، اور یہ لوگوں کے مزاج کا حصہ بن گئی ہیں؛ لیکن ان کی زندگی کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ خدا اور مذہب کے لئے ان کی زندگی میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس بات نے ان کو فطرت کا باغی بنا دیا ہے، بڑی سے لے کر چھوٹی باتوں تک قدم قدم پر فطرت سے بغاوت کا اظہار ہوتا ہے، انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ خدا کی طرف لپکتا ہے، خاص کر کوئی مصیبت سامنے آتے ہی، قرآن مجید نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کفر کیا، وہ بھی مصیبت کی گھڑی میں اللہ کو پکارتے ہیں، اور رسمی طور پر ہی صحیح عبادت گاہوں سے رجوع کرتے ہیں؛ لیکن یوروپ کے چرچ ویران ہیں، اور مردم شماری کے خانہ کے اعتبار سے جو لوگ عیسائی کہلاتے ہیں، وہ بھی چرچوں میں نہیں آتے۔

جب شیطان کسی فرد یا گروہ کے دل ودماغ کو مسخر کر لیتا ہے تو وہ اسے خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تبدیلی لانے پر اُکساتا ہے: ولآمرنهم فليغيرن خلق الله (النساء: ۱۱۹) یوروپ اس وقت اس کی واضح

مثال ہے، اگر کسی کو اس کی عملی مثال دیکھنی ہو تو اس کو یوروپ کو دیکھنا چاہیے، وضع قطع، باہمی تعلقات اور مردوں اور عورتوں کے ساتھ سلوک ہر جگہ فطرت سے بغاوت کا جذبہ نمایاں ہے، انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب ماں باپ کی عمر بڑھتی ہے تو اس کو ان کی خدمت کرنے یہاں تک کہ ان کا غصہ برداشت کرنے میں بھی لطف آتا ہے، بوڑھے ماں باپ کی ڈانٹ ڈپٹ ایسی لگتی ہے کہ گویا اولاد پر محبت کے پھول برس رہے ہوں؛ لیکن یوروپ میں والدین انسان کو ایسا بوجھ محسوس ہوتے ہیں کہ آدمی کتے اور بلی کی پرورش تو کر لیتا ہے؛ لیکن بوڑھے والدین کو اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہتا، یا تو وہ تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، یا ان کو اپنے پیاروں سے دور بوڑھوں کے ہاسٹل میں رکھ دیا جاتا ہے، جہاں کوئی ان سے محبت کے دو بول بولنے والا بھی نہیں ہوتا۔

مرد کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو اپنی بیوی بچوں کی ملکیت تصور کرتا ہے، ان کے ایک ایک سامان راحت کے لئے ہر طرح کی قربانی دیتا ہے، خود بھوکا رہ کر بچوں کو کھلاتا ہے، خود معمولی پہن کر ان کے لئے اچھے لباس کا انتخاب کرتا ہے؛ لیکن یوروپ کا مزاج ایسا ہے کہ بیوی مرد کے لئے محض نفسانی خواہش پوری کرنے کا ذریعہ ہے، دونوں ایک دوسرے پر قربان ہونے کے بجائے ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ حقوق کے طلب گار ہوتے ہیں، ایک بار لندن میں مجھے ایک ہندوستانی نژاد دوکان دار نے بتایا کہ ہندوستان میں میاں بیوی جب کوئی چیز لینے کے لئے آتے ہیں تو شوہر چاہتا ہے کہ بیوی کو اچھی سے اچھی چیز دلائے، چاہے اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہ بچے؛ لیکن یہاں جب مشترکہ استعمال کی چیز خریدتے ہیں تو شروع سے آخر تک لڑائی رہتی ہے کہ دوسرا فریق اس کی ادائیگی کرے، اور جب بیوی کے استعمال کی چیز لی جاتی ہے تو شوہر چاہتا ہے کہ وہی اس کی قیمت ادا کرے، شوہر کو ادا کرنا نہ پڑے۔

اولاد انسان کے لئے اس کی زندگی کے بعد سب سے بڑی نعمت ہوتی ہے، اور شوہر و بیوی دونوں خواہش مند ہوتے ہیں کہ شادی کے بعد وہ جلد سے جلد ماں باپ بن جائیں، اور جب اللہ کی طرف سے کوئی نیا بچہ پیدا ہوتا ہے تو پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے، یہ انسانی فطرت ہے، قرآن مجید نے کم از کم دو پیغمبروں کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے بڑے گریہ وزاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اولاد کی دعا فرمائی، ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام، دوسرے حضرت زکریا علیہ السلام، اور پھر وہ اولاد سے نوازے گئے؛ لیکن یوروپ میں ایک رجحان اولاد سے اجتناب کا پیدا ہوگیا ہے، شوہر و بیوی دونوں سمجھتے ہیں کہ بچے ہماری آزادی اور عیاشی میں خلل انداز ہوں گے؛ اس لئے ان سے جس قدر دامن بچایا جائے، بہتر ہے؛ اس لئے بعض لوگ تو پوری زندگی میں

بے اولاد گزار لیتے ہیں، اور بعض دیر سے ماں باپ بننا پسند کرتے ہیں اور اگر کسی کے یہاں ایک سے دو بچے ہو گئے ہوں تو اس کے بعد مزید اولاد ان کے لئے بالکل ناقابل قبول ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ فطرت کے خلاف بات ہے، دنیا بھر میں جتنی اہم شخصیتیں گزری ہیں، ان میں سے زیادہ تر کے ماں باپ کثیر الاولاد تھے، اور قدرت کی طرف سے ان کی پیدائش کا نمبر چوتھا، پانچواں، چھٹا وغیرہ تھا، اولاد کی جو فطری طلب انسان میں رکھی گئی ہے، اس کو عام طور پر کتوں اور بلیوں سے پورا کیا جاتا ہے، کتوں کی اتنی ناز برداری کی جاتی ہے جو کسی طرح ہمارے ملک میں بچوں کی ناز برداری سے کم نہیں ہے۔

انسان کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ بچوں کو اپنی آغوش محبت میں رکھنا چاہتا ہے؛ اسی لئے ماں بننے کے ساتھ ہی عورت کے سینے سے دودھ کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے، جو نومولود کے کام آتا ہے، ماں سے اگر اس کا بچہ چھین لیا جائے تو وہ دماغی عارضہ کا شکار ہو جاتی ہے، اگر شوہر و بیوی میں علیحدگی کی نوبت آئے تو شوہر کو سب سے زیادہ اسی کی فکر ہوتی ہے کہ اس کے بچے اس سے دور ہو جائیں گے، محبت کا، پرورش کا اور اپنی گود میں کھلانے کا یہ جذبہ ایک فطری جذبہ ہے؛ لیکن یوروپ میں عورتیں چاہتی ہیں کہ بچہ کو اپنا دودھ پلانا نہ پڑے، بچے ڈبوں کا دودھ لیں، بہت کم عمری اور بعض اوقات شیر خواری کی عمر میں بچوں کو ایسی پرورش گاہوں اور اسکولوں کے حوالہ کر دیا جاتا ہے، جہاں چھوٹے بچوں کی پرورش ہوتی ہے، ماں باپ اپنی اپنی ملازمت گاہوں میں چلے جاتے ہیں، چھوٹے بچوں کا تعلق اپنے ماں باپ سے ۲۴ر گھنٹوں میں چند گھنٹے کا ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ فطرت سے بغاوت کی ہی ایک شکل ہے!

شوہر و بیوی کا رشتہ بڑا اہم رشتہ ہوتا ہے؛ اگر چہ اس سے ایک نفسانی اور جسمانی سکون دونوں فریق کو ملتا ہے؛ لیکن اس کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس سے شوہر اور بیوی کو ایک پُرسکون زندگی حاصل ہوتی ہے، ان کو ۲۴ر گھنٹے کی زندگی میں ایک مونس وغمخوار اور بے حد بھروسہ مند ساتھی میسر آتا ہے، وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں، اور یہ محبت زندگی کی آخری سانس تک قائم رہتی ہے، یوروپ کے بعض مفکرین کا خیال ہے کہ یہ محبت جنسی کشش کی وجہ سے ہوتی ہے؛ لیکن یہ غلط ہے، شادی کے کچھ عرصہ کے بعد دونوں فریق کے جنسی جذبات کم ہونے لگتے ہیں، اور ایک عرصہ کے بعد نہ مرد میں اس پہلو سے عورت کے لئے کشش ہوتی ہے اور نہ عورت میں مرد کی؛ لیکن یہ محبت اس وقت بھی باقی رہتی ہے؛ بلکہ نوجوانی اور جوانی کے مقابلہ ادھیڑ عمر اور بڑھاپے میں ایک دوسرے کا لحاظ وخیال بڑھ جاتا ہے، اسی وجہ سے شوہر و بیوی کے درمیان طلاق کے واقعات شاید ایک فی ہزار

سے بھی کم پیش آتے ہیں؛ لیکن مغرب میں بہت سے جوڑے شادی کو بھی ذائقہ چشی کا ذریعہ سمجھتے ہیں، شب وروز رشتے ٹوٹتے بھی ہیں اور نئے رشتے قائم بھی ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے بے وفائی کی شکایت عام ہے، رشتۂ نکاح قائم رکھتے ہوئے بھی مرد وعورت دونوں اپنی وفاداری کو ایک دوسرے کے لئے محفوظ نہیں رکھ پاتے، یہ بھی فطرت کے خلاف ہے، اگر میاں بیوی کے لئے ایک دوسرے کا وفادار بن کر رہنا ضروری نہیں ہوتا تو انسانوں میں نکاح کا نظام قائم نہیں ہوتا، جیسے دوسرے نر و مادہ جانور مخالف جنس سے اپنی ضرورت پوری کر لیتے ہیں، انسان بھی پوری کر لیتا اور بس۔

انسان کے اندر جنسی ضرورت کا بھی ایک داعیہ رکھا گیا ہے، جس کا ایک اہم مقصد توالد وتناسل کا سلسلہ جاری رکھنا ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو مرد عورت کی دو جنسوں کی شکل میں پیدا فرمایا ہے، اور دونوں کے اندر ایک دوسرے کے جنسی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھی گئی ہے؛ اس لئے فطری نظام یہی ہے کہ جنسی ضرورت مرد عورت سے اور عورت مرد سے پوری کرے، اگر مرد مرد سے اور عورت عورت سے اپنی شہوت پوری کرے تو یہ فطرت کے خلاف ہے، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کا عمل انسان کی صحت کے لئے بھی اور انسانی سماج کی بقا کے لئے بھی حد درجہ نقصان دہ ہے؛ لیکن مغرب نے ہم جنس پرستی کو اس طرح قبول کر لیا ہے کہ گویا اپنے عقیدہ اور ایمان کا حصہ بنا لیا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اس کے خلاف بولتا ہو، یا اس کے خلاف لکھتا ہو تو وہ پورے معاشرہ میں نشانۂ ملامت بن جاتا ہے، اور الیکشن میں اس کو ووٹ تک نہیں دیا جاتا۔

انسان کی فطرت میں ستر پوشی بھی داخل ہے، قرآن مجید میں ہے کہ حضرت آدم اور حواء علیہما السلام کو جب جنت میں ممنوعہ پھل کھانے کی پاداش میں جنت سے نکالا گیا، تو سب سے پہلے ان کے جسم پر جنت کا جو لباس تھا، وہ اُتر گیا اور وہ مضطربانہ اپنے جسم ڈھکنے لگے (اعراف: ۲۲) حالاں کہ جنت کی اس وسیع دنیا میں صرف حضرت آدم اور حضرت حواء ہی تھے، پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے اپنا جسم چھپانے لگے، یعنی جسم کے بہت سے حصوں کو چھپانا فطرت کا حصہ ہے، اور ننگا پن فطرت کے خلاف ہے؛ مگر اس وقت یورپ عریانیت کا وکیل ونقیب ہے، ایسے مقامات بھی ہیں، جہاں مرد وعورت بالکل بے لباس ہوتے ہیں، چند سال پہلے میں ٹورنٹو (کینیڈا) میں تھا، تو ایک دن معلوم ہوا کہ آج شہر میں عورتوں کا ایک بڑا جلوس نکلنے والا ہے، جس میں عورتیں بہ طور احتجاج اپنا سینہ کھلا رکھیں گی، ان کا کہنا ہے کہ جب مردوں پر سینہ چھپانا لازم نہیں ہے تو عورتوں کے لئے یہ کیوں لازم ہے؟ حد تو یہ ہے کہ بعض مقامات پر وہ جنسی افعال جن کو انسان فطری طور پر رات کی تاریکی اور کمرے کی تنہائی میں انجام

دیتا ہے، کوبھی کھلے عام انجام دیا جاتا ہے، یہ فطرت سے بغاوت کی بدترین شکل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے نکاح کا نظام رکھا ہے؛ تاکہ ماں باپ کے ذریعہ بچے وجود میں آئیں، اس کے ذریعہ خاندان کی تشکیل ہوتی ہے، اور ہر انسان کو اپنی پہچان حاصل ہوتی ہے، مشرقی سماج میں اگر کسی کے باپ کا پتہ نہیں ہو تو یہ اس کے لئے آخری درجہ عار کی بات ہوتی ہے؛ مگر مغرب کا حال یہ ہے کہ وہاں سنگل مدر (Single Mother) کا رواج عام ہو رہا ہے، اور اس میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی جاتی ہے؛ اس لئے بن باپ کے بچوں کی کثرت ہے؛ لیکن اب اس سے آگے بڑھ کر کوشش کی جا رہی ہے کہ کئی مردوں کے مادۂ تولید کو ملا کر مخلوط شکل میں عورت کے رحم تک پہنچایا جائے، اور ایسا بچہ وجود میں لایا جائے، جس کی ماں تو ایک ہو؛ لیکن باپ کئی ہوں۔

فطرت سے بغاوت کا یہ جذبہ ہر شعبہ زندگی میں نمایاں ہے، اسلام نے نفع حاصل کرنے کے لئے تجارت کا طریقہ رکھا ہے، اور اگر کئی لوگوں کا سرمایہ ہو تو شرکت اور مضاربت کے طریقے مقرر کئے ہیں کہ مختلف لوگوں کا سرمایہ بھی ہو اور ان کی محنتیں بھی ہوں، نفع میں بھی سب کی شرکت ہو اور نقصان میں بھی سب کی شرکت ہو، یہ پوری طرح قانون فطرت کے مطابق ہے؛ کیوں کہ کوئی بھی تجارت ہو، اس میں نفع ونقصان دونوں کا امکان یکساں رہتا ہے؛ لیکن مغرب نے اس پر سود کو ترجیح دی، ایک شخص سرمایہ لگائے، نفع تو حاصل کرے؛ لیکن کاروبار کے نقصان سے بے پرواہ ہو جائے، اس میں یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ جیسے پودے از خود بڑھتے ہیں، اسی طرح روپیہ پیسہ بھی از خود بڑھتا ہے، یہ فطرت کے خلاف ہے؛ کیوں کہ روپیہ کے ساتھ جب تک انسان کی محنت شامل نہ ہو، روپیہ میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا، مغرب نے سودی نظام کو اس قدر بڑھا دیا کہ بینک سود کے ذریعہ تو نفع حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے کھاتہ داروں کو نفع دے سکتے ہیں؛ لیکن وہ کوئی بزنس نہیں کر سکتے ہیں، اس سودی نظام نے پوری دنیا میں دولت اور غربت کے فاصلے بڑھا دیئے، اور پورے ملک کی دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی۔

زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات میں مغرب کی اس سوچ کی مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے پانی کو جن مقاصد کے لئے پیدا کیا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ وہ چیزوں کو صاف کر دیتی ہے؛ اسی لئے آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے پانی سے استنجاء کرنے کو فطرت کے تقاضوں میں شمار کیا ہے (مسلم عن عائشہؓ، حدیث نمبر: ۲۶۱) کیوں کہ پانی سے نجاست کا حجم بھی صاف ہوتا ہے، اس کے نہ نظر آنے والے چھوٹے چھوٹے اجزاء بھی دھل جاتے ہیں، اور بو بھی ختم ہو جاتی ہے، اور بیماریوں سے حفاظت ہو جاتی ہے؛ مگر آج کل مغرب اور مغرب کے زیر

اکثر ملکوں میں پانی سے استنجاء کے بجائے ٹیشو پیپر (Tissue Paper) سے استنجاء کا عمومی ماحول ہوگیا ہے، مجھے خود افریقہ سے لے کر یوروپ اور کنیڈا تک اس کا تجربہ ہوا کہ شاندار ائیر پورٹ ہے، ساری سہولتیں ہیں، پانی کی فراوانی ہے؛ مگر استنجاء کے لئے پانی نہیں ہے۔

غرض کہ اگر اسلامی تمدن اور مغربی تمدن کے فرق کو سمجھنا ہے تو اس جہت سے جائزہ لینا چاہئے، عقیدہ، عبادت، معاشرت، معیشت، خاندانی تعلقات، سماجی مراسم ہر جگہ شریعت اسلامی میں فطرت کی عکاسی نظر آتی ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''فأقم وجھک للدین حنیفا، فطرت اللہ التي فطر الناس علیھا، لا تبدیل لخلق اللہ، ذلک الدین القیم، ولکن اکثر الناس لا یعلمون (الروم: ۳۰) ترجمہ: لہٰذا یکسو ہو کر آپ اسی دین کی طرف اپنا رُخ کئے رہئے، اللہ کی عطا کی ہوئی اسی فطرت کی پیروی کیجئے، جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، یہی درست اور سیدھا دین ہے؛ لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

خالق کائنات کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق کائنات کی چیزوں کو استعمال کرنے میں انسانی کی بھلائی ہے، اس سے انسانی فائدہ اٹھاتا ہے اور نقصان سے محفوظ رہتا ہے، اور کسی بھی شعبۂ زندگی میں اگر انسان خالق کی بنائی ہوئی فطرت سے بغاوت کرتا ہے تو خود ہی اس کا نقصان اٹھاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے دھونے کے لئے پانی کو پیدا فرمایا ہے اور پکانے کے لئے آگ کو، اگر کوئی شخص آگ سے غسل کرے اور کپڑے دھونے لگے اور پکوان کی ہانڈی کے نیچے آگ سلگانے کے بجائے پانی کا پیالا رکھ دے تو کیا، وہ اس سے اپنا مقصد حاصل کر پائے گا؟ پہلی صورت میں اس کی جان جائے گی اور دوسری صورت میں وہ پکے ہوئے کھانے سے محروم ہوگا، یہی حال زندگی کے تمام شعبوں کا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو غذا بنانے سے منع فرمایا ہے، وہ فطری طور پر کھانے کے لائق نہیں ہیں، ان سے انسان کو جسمانی اور اخلاقی طور پر سخت نقصان پہنچتا ہے، جس کی واضح مثال شراب اور سور ہے؛ اس لئے کہ یہ فطرت کے خلاف ہے اور پوری دنیائے علم اس کے صحت انسانی کے لئے مضر ہونے پر متفق ہے، یہی حال زندگی کے تمام شعبوں کا ہے، اسلام دین فطرت ہے اور عقیدہ وعبادت سے لے کر معاشرت ومعیشت تک اس کے تمام احکام قانون فطرت پر مبنی ہیں، اور اس کی مخالفت نہ صرف اللہ کو ناراض کرنے والی ہے؛ بلکہ دنیا میں بھی انسان کے لئے سخت نقصان اور خسران کا باعث ہے؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب ایک طرح کی خودکشی ہے، اور مغربی دنیا اس اجتماعی خودکشی کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

مسلمانوں کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایسے دین سے نوازا ہے، جس میں آخرت کی کامیابی تو ہے ہی، دنیا کی فلاح و بہبود بھی ہے، اور اس راستہ سے انحراف دنیا وآخرت دونوں کے لئے مصیبت اور نقصان کا باعث ہے؛ مگر افسوس مشرقی قومیں مغرب کی علم وتحقیق کی کامیابی اور تمدنی ناکامیوں اور فکری نامرادیوں کے درمیان فرق نہیں کر پاتی ہیں، اور مغرب کی طرف سے آنے والی ہر چیز پر اس طرح لبیک کہتی ہیں کہ گویا یہ کامیابی کی ضمانت اور ترقی کی معراج ہے، مغربی ملکوں کا جو گاہے گاہے سفر کا موقع ملا، اس نے اس بات کو ذہن پر نقش کر دیا ہے کہ مغرب کی سائنسی ترقیات نے یقیناً ان کے عشرت کدوں کو سجایا اور سنوارا ہے؛ لیکن فکری اور اخلاقی بحران اور اس کی وجہ سے تہذیبی انحراف نے ان کی زندگیوں کو بے سکون اور بے مقصد بنا دیا ہے۔

• • •

فتاویٰ

مفتی شاہد علی قاسمی
(دارالافتاء المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

کرکٹ میں جوئے کی شکلیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

ہمارے یہاں ایک کرکٹ ٹورنامنٹ ہوتا ہے، اس میں پیسوں کی آمد کی شکل یہ ہوتی ہے کہ جتنے بھی لوگ اس ٹورنامنٹ میں شامل ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک رقم متعین ہوتی ہے، مثلاً ۵۰۰/روپے اور جو ٹیم کا کپتان ہوتا ہے اس کے لیے ۷۰۰/روپے متعین ہوتے ہیں، اسی طرح دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اسپانسر اپنی کمپنی یا دوکان کے پرچار کے لیے اسپانسر شپ لیتے ہیں، اور کچھ رقم دیتے ہیں، اور تیسری شکل یہ ہوتی ہے کہ کچھ لوگوں سے چندہ لیا جاتا ہے، اس طرح پیسوں کی آمد ہوتی ہے، جس میں خرچ کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے ایک شکل عمومی اور ایک خصوصی ہوتی ہے۔

عمومی شکل:

(۱) تمام شرکاء کو ٹی شرٹ دی جاتی ہے۔　　(۲) کھانا کھلایا جاتا ہے۔

(۳) جس جگہ یہ ٹورنامنٹ ہوتا ہے اس کا کرایہ بھی اسی رقم سے دیا جاتا ہے۔

خصوصی شکلیں:

(۱) مین آف دی میچ　　(۲) مین آف دی ٹورنمنٹ

(۳) پلییَر آف دی ٹورنمنٹ　　(۴) بولر آف دی ٹورنمنٹ

اس طرح جمع کی ہوئی رقم کو صرف کیا جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟ اگر جائز نہیں تو اس کے جواز کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ واضح ہو کہ اس میں کچھ ذمہ دار قسم کے

لوگ بھی کھیلتے ہیں، جن کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی نماز بھی باجماعت ہو جاتی ہے:

(عارض: الماس اندوری بمعرفت تذکیر خان)

الجواب وباللہ التوفیق!

(۱) کرکٹ ٹورنامنٹ کا انعقاد عام طور پر چند مفاسد پر مشتمل ہوتا ہے، ان میں چند اہم یوں ہیں: فرائض و عبادات میں کوتاہی، وقت کا ضیاع، جوا کی شکلوں کا پایا جانا وغیرہ؛ اس لیے کرکٹ ٹورنامنٹ کا انعقاد شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ نہ ہو تو ناجائز ہے اور اگر شرعی حدود کی رعایت ہو تو جائز ہے، پھر بھی مستحسن نہیں ہے....... دریافت کردہ شکل میں اگر ہر کھلاڑی سے پیسے لے کر ٹورنامنٹ کے انتظامی اخراجات پورے کیے جاتے ہوں، اور بچی ہوئی رقم سے انعامات دیے جاتے ہوں تو یہ قمار میں داخل ہے جو ناجائز ہے۔

(۲) اگر کوئی تیسری پارٹی ٹورنامنٹ کے تمام اخراجات ادا کرے جو کھیل میں شریک نہ ہو تو اس کی اجازت ہوگی، اسپانسر شپ کی جو شکل آپ نے پیش کی ہے، یہ اسی دائرے میں ہے؛ لہٰذا اس شکل کو اختیار کرنے کی گنجائش ہے، اور تیسری شکل جو آپ نے لوگوں سے چندہ لے کر ٹورنامنٹ کرانے کی پیش کی ہے، تو یہ بھی درست ہے، بشرطیکہ کسی سے چندہ لیتے ہوئے اس پر جبر نہ ہو اور دینے والا خوش دلی سے دے، اب اس جمع شدہ رقم کا استعمال کھلاڑیوں کو کھانا کھلانے، میدان کا کرایہ ادا کرنے اور کھلاڑیوں کو خصوصی انعامات دینے میں کیا جائے تو درست ہے؛ کیونکہ یہ قمار میں داخل نہیں ہے۔

(۳) اگر کھلاڑیوں سے پیسہ لے کر ہی ٹورنامنٹ کروانا ہو تو اس کے جواز کی ایک شکل یہ ہے کہ کسی کمیٹی کو ان پیسوں کا مالک بنا دیا جائے، اور وہ کمیٹی حسب منشا انتظامی امور اور انعامات میں خرچ کرے، اور خرچ کرنے میں اس پر کسی طرح کا دباؤ نہ ہو۔

> (ولا بأس بالمسابقة في الرمي والفرس) والبغل والحمار، كذا في الملتقى والمجمع، وأقره المصنف هنا خلافاً لما ذكره في مسائل شتى، فتنبه. (والإبل و) على (الأقدام) ... (حل الجعل) ... (إن شرط المال) في المسابقة (من جانب واحد وحرم لو شرط) فيها (من الجانبين)؛ لأنه يصير قمارًا (إلا إذا أدخلا ثالثًا) محللاً (بينهما) بفرس كفء لفرسيهما يتوهم أن يسبقهما وإلا لم يجز ثم إذا سبقهما أخذ منهما وإن سبقاه لم يعطهما وفيما بينهما أيهما سبق أخذ من صاحبه ... وأما السباق بلا جعل

فيجوز في كل شيء كما يأتي.(الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار:402/6)

بیت الخلاء کی چھت پرنماز کی ادائیگی

سوال کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں:

ہمارے محلے کی مسجد میں جمعہ کی نماز میں مجمع کی کثرت کی وجہ سے کچھ صفیں مسجد کے بیت الخلاء کی چھت پر بن جاتی ہیں،تو کیابیت الخلاء کی چھت پرنماز درست ہوجاتی ہے؟

(عارض:ایک بندہ خدا،ناندیڑ)

الجواب وبالله التوفيق:

نماز پڑھتے ہوئے قدموں کے نیچے یاسجدہ کی حالت میں پیشانی کے نیچے ناپاکی ہوتو نماز فاسد ہوجاتی ہے،لیکن اگرناپاک زمین کو پاک گارے(گلاوے) سے لیپ دیا جائے پھراُس پرنماز پڑھی جائےتو نماز ہوجاتی ہے،اِسی طرح اگر ناپاک جگہ پرموٹا کپڑا بچھا دیا جائے پھراُس پر نماز پڑھی جائےتو بھی نماز درست ہوجاتی ہے، خواہ ناپاکی کی بدبومحسوس ہورہی ہو،اس سلسلہ میں علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قال في المنية: وإذا أصابت الأرض نجاسة ففرشها بطين أو جص فصلى عليها جاز ....وكذا الثوب إذا فرش على النجاسة اليابسة. فإن كان رقيقاً يشفّ ما تحته أو توجد منه رائحة النجاسة على تقدير أن لها رائحة لا تجوز الصلاة عليه. وإن كان غليظاً بحيث لا يكون كذلك جازت......ولو كان بقربه نجاسة يشمّ ريحها لا تفسد صلاته" (ردالمحتار: 2/387)

لہذادریافت کردہ صورت میں بیت الخلاء کی چھت پرنماز درست ہے،کیونکہ اس چھت پر ناپاکی نہیں ہے،ناپاکی چندفٹ نیچے ہے،جونقصان دہ نہیں۔

گڈول(اچھی ساکھ) کی بیع

سوال: کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ:

یہاں بروڈا میں ایک صاحب کومسئلہ درپیش ہے جو بعینہ میں نقل کرتا ہوں: میں آخری دس سالوں سے حج اور عمرہ کےٹوراورٹراویل کا کام کررہاہوں اورالحمدللہ میری اچھی خاصی گڈول

ہے، اس کاروبار میں ایک شخص صرف اورصرف سرمایہ دے کر متعین فیصد نفع/نقصان میں پارٹنر بننا چاہتا ہے تو اب اس کی درج ذیل شکلوں میں سے کون سی درست ہے۔(۱) میں اسے فقط روپیہ لے کر حصہ دار بنا سکتا ہوں؟ (۲) اس کی حصہ داری کے طور پر دیئے سارے یا بعض روپیوں کو صرف اسی کاروبار میں استعمال کرنے ہوں گے؟ کیونکہ جو رقم میں اس سے پارٹنر شپ کے طور پر لوں گا، وہ میرے کاروبار کی گڈول کی حصہ داری سمجھی جائے گی، تو کیا ایسا کرنا صحیح ہوگا؟ (۳) میرے اوپر قرض ہوگیا ہے، اب میں اس کو شریک بنا کر قرض میں ساری یا بعض رقم ادا کرنا چاہوں، تو کیا یہ صحیح ہوگا؟

(محمد اسماعیل بڑودہ، گجرات)

الجواب وبالله التوفيق:

صرف گڈول ایسا مال نہیں ہے جس کے کچھ حصہ کو بیچا جائے، جیسا کہ فتاوی محمودیہ جلد ۱۶ ص: ۱۷۸، کتاب البیوع اور امداد الاحکام، جلد: ۴ ص: ۴۵۲، کتاب البیوع میں ہے، اس لئے دریافت کردہ شکل میں محض گڈول میں دوسرے کو بالعوض شریک کرنا درست نہیں ہے، ہاں اگر آپ کے اس ٹور اور ٹراویلس کے اثاثہ جات جیسے آفس، گاڑی، فرنیچر و دیگر اشیاء ہوں تو ایسا ہوسکتا ہے کہ ان سب کی مالیت لگائی جائے اور مالیت لگاتے ہوئے کاروبار کی گڈول کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے کل مالیت نکالی جائے، اب اس مجموعی مالیت کا کچھ حصہ آپ پارٹنر کو فروخت کرسکتے ہیں، مجموعی مالیت کا جتنا فیصد وہ خریدے گا اسی تناسب سے وہ کاروبار کا مالک اور شریک سمجھا جائے گا، اور اسی تناسب سے کاروبار کے فائدہ کا حق دار ہوگا، البتہ آپ کی اضافی محنت کی وجہ سے یہ بات بھی درست ہوگی کہ آپسی سمجھوتہ سے آپ اپنی ملکیت کے تناسب سے زیادہ نفع رکھیں اور پارٹنر کو اس کی ملکیت کے تناسب سے کم نفع دیں، علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وإن شرطا الربح للعامل أكثر من رأس ماله جاز أيضاً على الشرط (رد المحتار مع الدر: 312/4، كتاب الشركة)

نیز آئندہ جب کبھی وہ پارٹنر نکلنا چاہے تو اس وقت کاروبار کی اثاثہ جات کے ساتھ جو مالیت آئے اسی مالیت سے پارٹنر کا ملکیت والا تناسب دے دیا جائے، اس ترتیب کو اختیار کرنے میں پارٹنر شپ کا معاملہ بھی درست ہوگا اور پارٹنر سے ملنے والی قیمت کے آپ تنہا مالک ہوں گے جسے آپ حسب منشاء خرچ کرسکتے ہیں، اور قرض وغیرہ ادا کرسکتے ہیں۔

نکاح میں موجود دولہے کی کی جگہ کسی دوسرے کا نام لینا

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

ایک لڑکی کا نکاح ہوا اور لڑکی دولہے کے نام زید سے ناواقف تھی، اور عقد نکاح میں دوسرے لڑکے بکر کو دولہے کی جگہ بٹھایا گیا؛ لیکن نکاح پڑھانے والے نے زید کا نام لے کر نکاح پڑھایا، جب کہ زید مجلس نکاح میں موجود نہیں تھا، اس کی جگہ بکر تھا، اور لڑکی خود مجلس نکاح میں موجود تھی؛ اس نے بکر کو ہی زید سمجھ کر نکاح کی اجازت دی، اب جب خلوت کے وقت زید پہونچا تو لڑکی نے شور مچایا کہ تم میرے شوہر نہیں ہو، میرا جس کے (بکر کے) ساتھ نکاح ہوا، اس کے تو بال تھے اور تم گنجے ہو، تو سب گھر والوں نے یہ کہا کہ نہیں، یہی زید تمہارا شوہر ہے، دولہے کی جگہ بیٹھنے والا بکر تمہارا شوہر نہیں ہے، جب کہ لڑکی نے بکر کو زید سمجھ کر ہی نکاح کی اجازت دی تھی، تو زبردستی اس لڑکی کو اس کے ساتھ کردیا تو کیا یہ نکاح شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟ جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

سائل: مجیب الرحمٰن، سنبھل

الجواب و باللہ التوفیق:

دریافت کردہ شکل میں لڑکی کو دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے، نکاح کے وقت قصدا بکر کو رکھا گیا، تاکہ اسے دیکھ کر لڑکی انکار نہ کرے، اگر اصل لڑکا زید کو سامنے بیٹھایا جاتا تو لڑکی انکار کرسکتی تھی، اب جب کہ لڑکی نے بکر کو دیکھ کر نکاح منظور کیا، اور بکر نے ہی ایجاب کے بعد قبول کیا تو نکاح بکر ہی سے منعقد ہوگیا، گو کہ ایجاب و قبول میں زید کا نام لیا گیا، کیونکہ بکر کی طرف اشارہ پایا گیا اور اصول ہے کہ جب اشارہ اور تسمیہ میں ٹکراؤ ہوجائے تو اشارہ کو غلبہ دیا جاتا ہے، اور تسمیہ لغو ہوجاتا ہے، لہذا لڑکی کے بیان کے مطابق بکر اس کا دولہا ہوگا، نہ کہ گھر والوں کے بیان کے مطابق زید۔

أَيْ فَإِنَّهَا لَوْ كَانَتْ مُشَارًا إِلَيْهَا وَغَلِطَ فِي اسْمِ أَبِيهَا أَوْ اسْمِهَا لَا يَضُرُّ لِأَنَّ تَعْرِيفَ الْإِشَارَةِ الْحِسِّيَّةِ أَقْوَى مِنْ التَّسْمِيَةِ، لِمَا فِي التَّسْمِيَةِ مِنْ الِاشْتِرَاكِ لِعَارِضٍ فَتَلْغُو التَّسْمِيَةُ عِنْدَهَا، كَمَا لَوْ قَالَ اقْتَدَيْت بِزَيْدٍ هَذَا فَإِذَا هُوَ عَمْرٌو فَإِنَّهُ يَصِحُّ (رد المحتار مع الدر المختار: 26/3)

مال حرام سے مسجد کیلئے زمین وقف کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان دین مسئلہ ذیل کے بارے میں:
ایک شخص نے مسجد کیلئے جگہ وقف کی، پھر اس پر اہل محلہ نے رقم جمع کر کے مسجد تعمیر کی، بعد میں پتہ چلا کہ جس شخص نے مسجد کیلئے جگہ وقف کی تھی، اس کا مال صحیح نہیں ہے، محلہ والوں نے رقم جمع کر کے اس کو لوٹانا چاہا؛ مگر اس نے اس رقم کو لینے سے انکار کر دیا اور کہا: مجھے رقم کی حاجت نہیں ہے اور میں نے اللہ کیلئے جگہ وقف کی ہے، صورت مسئولہ میں مسجد میں نماز پڑھنے کا حکم کیا ہوگا اور اس مسجد کا شرعی حکم کیا ہے؟

(محمد عمیر، ناندیر)

الجواب وبالله التوفيق:
مسجد کیلئے جگہ وقف کرنے والے کی آمدنی صحیح نہ ہو تو اگر اس کی اکثر آمدنی حرام ہو تو ایسے شخص کی رقم مسجد میں لگانا درست نہیں ہے، اور اگر اکثر آمدنی حلال ہو اور کچھ حرام ہو تو مسجد کیلئے اس کا تعاون لیا جا سکتا ہے:

إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام ،فان كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية (فتاوى هنديه، ۵/۳۴۲)

اگر سوال میں مذکور شخص کی اکثر یا کل آمدنی حرام ہو تو آپ حضرات نے جو کوشش کی تھی کہ زمین کی رقم زمین دینے والے کو واپس کی جائے، یہ اقدام درست اور بہتر تھا؛ لیکن انہوں نے رقم لینے سے انکار کر دیا تو بھی رقم لوٹانے کی ممکنہ شکلیں ہیں، جیسے: خاموشی سے ان کے اکاؤنٹ میں رقم واپس کر دینا، یا انہیں ترغیب دی جا سکتی ہے کہ فی الوقت آپ رقم واپس لے لیں، آئندہ ہم لوگ آپ کا تعاون قبول کریں گے اور دل میں ہو کہ جب آئندہ ان کا حلال معاملہ ہوگا تو تعاون قبول کریں گے، وغیرہ — تاہم اگر ان سب میں دشواری ہو تو آخری تدبیر یہ ہے کہ اتنی مالیت کا فقراء پر تصدق کر دیا جائے، جیسا کہ مال حرام کے تعلق سے اصول ہے یا تو رد الی المالک (مالک کو واپس کرنا) ہو یا بلا نیت ثواب فقراء پر تصدق ہو، جیسا کہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں بھی ہے:

البتہ مسجد کی تعمیر میں جتنا ناجائز پیسہ لگا ہے، اگر اتنا پیسہ دینے والے کو واپس کر دیا جائے، یا بلا نیت ثواب غربا و مساکین کو دے دیا جائے تو کراہت ختم ہو جائے گی، (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، (914-91/B9/1436-U)

لہذا جتنا جلد ہو، مذکورہ بالا تدبیر اختیار کریں، تا کہ اس میں نماز بلا کراہت جائز ہو جائے، تاہم فی الوقت وہ مسجد مسجد ہی ہے، البتہ جب تک زمین کی مالیت کے بقدر رقم واپس نہ ہو، یا صدقہ نہ کیا جائے، نماز مکروہ تحریمی رہے گی۔

اسکول کو مسجد میں تبدیل کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل کے بارے میں؟

ضلع رانچی کے قصبہ کانکے میں ایک عصری درس گاہ (MORDEN SCHOOL) مدرسہ فیض العلوم کے نام سے ۱۹۵۳ء میں قائم کیا گیا، ایک عرصے تک بحسن وخوبی یہ ادارہ چلتا رہا؛ پھر بعض وجوہات کی وجہ سے یہ ادارہ بند ہوگیا؛ ادھر تقریبا دس بارہ سالوں سے یہ ادارہ بند ہے، اور اس کی عمارت خالی پڑی ہے، دو چار ماہ قبل علاقے کے لوگوں کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اب اس جگہ کو مسجد میں تبدیل کر دیا جائے، اسکول کی عمارت چار ڈسمل زمین میں بنی ہے، عمارت تو دو منزلہ ہے، لیکن انتہائی شکستہ حالی کا شکار ہے، عمارت کی تین طرف لوگوں کے مکانات ہیں، اور سامنے کی طرف راہ عام ہے، مطلب یہ ہے کہ زمین میں اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے؛ بلکہ یہ ممکن ہے کہ روڈ کی توسیع کے وقت کچھ زمین روڈ میں چلی جائے، زمین کی نوعیت کے تعلق سے یہ عرض ہے کہ واقف نے اس زمین کا جو وقف نامہ چھوڑا ہے اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ اراکین و ذمہ داران مسجد چوڑی ٹولہ کانکے وقف کے نگراں ہیں، اسی طرح مقصد وقف کی صراحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ زمین مذہبی تعلیم کے لیے استعمال میں لائی جائے اور کوئی نیک عمل جس میں تمام مسلمانوں کی فلاح و بہبود وابستہ ہو، اس پس منظر میں مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات مطلوب ہیں:

- کیا اس زمین میں مسجد کی تعمیر کی جاسکتی ہے؟
- کیا فی الحال شکستہ حال عمارت کو وقتی طور پر ہلکی پھلکی ترمیم کرکے نماز خانہ بنایا جا سکتا ہے؟ تا آنکہ شکستہ حال عمارت کو مسمار کرکے از سر نو مسجد بنایا جائے؟
- اسکول کی عمارت میں ایک جگہ بیت الخلاء بنا ہوا تھا جو تقریبا آٹھ نو سالوں سے بالکل استعمال میں نہیں ہے، مسجد کی نئی تعمیر کے وقت کیا اسے نماز کے لئے مخصوص جگہ میں شامل کیا جاسکتا ہے؟

(مستفتی: صغیر احمد، محمد جاوید حسین، ادریس انصاری، محمد مبین انصاری، چوڑی ٹولہ، کانکے، جھارکھنڈ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) آپ کے پیش کردہ وقف نامہ کو پڑھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ واقف کا منشاء مذہبی تعلیم دینا اور ایسا نیکی کا کام ہے جو عام لوگوں سے متعلق ہو، اس پس منظر میں اس جگہ مکتب یا دینی مدرسہ قائم کرنا واقف کے منشاء کے عین مطابق ہے، اور اگر وہاں مسجد بنا کر مکتب کا نظام بھی چلایا جائے تو اس کی بھی اجازت ہے؛ کیونکہ مسجد نیک کام کرنے یعنی عبادت کرنے کی جگہ ہے جس سے ہر مسلمان کا دینی فائدہ متعلق ہوتا ہے؛ لہذا مسجد بنانے کی واقعی ضرورت ہو تو مسجد بنالی جائے، اور ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا نظم بھی مکتب وغیرہ کی شکل میں ہو، علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مُرَاعَاةُ غَرَضِ الْوَاقِفِينَ وَاجِبَةٌ وَالْعُرْفُ يَصْلُحُ مُخَصِّصًا (رد المحتار: ۴/۴۴۵)

(۲) چونکہ اس زمین کے ذمہ داران متعین ہیں، لہذا جب تک یہ حضرات مسجد کی نیت نہیں کریں گے، تب تک یہ جگہ مسجد نہیں بنے گی، لہذا فی الحال موجودہ عمارت میں ہلکی ترمیم کرکے اسے نماز خانہ کی حیثیت دے کر نماز پڑھی جائے تو حرج نہیں ہے، آئندہ جب باضابطہ تعمیر مکمل ہو اور مسجد کی نیت سے نماز باجماعت پڑھی جائے تب وہ جگہ مسجد شرعی ہوگی۔

(ويزول ملكه عن المسجد والمصلى) بالفعل و (بقوله جعلته مسجدا) عند الثاني (وشرط محمد) والإمام (الصلاة فيه) وفي الرد: قوله: وشرط محمد والإمام الصلاة فيه) أي مع الإفراز كما علمته (رد المحتار 4/356)

(۳) اسکول کا بیت الخلاء جو آٹھ نو سال سے بند ہے، اسے مسجد کا حصہ بنانے میں حرج نہیں ہے۔

• • •

معہد اپنے فضلاء سے کیا چاہتا ہے؟

- اہل سنت والجماعت کے معتبر شارحین کی آراء پر استقامت۔
- اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ تینوں مکاتبِ فکر کا احترام۔
- عقیدۂ توحید میں ان تشریحات کی پابندی جو حضرت محمد مولانا قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اختیار فرمائی ہے۔
- سلفِ صالحین کے درمیان اعتقادی وفروعی مسائل میں جو اختلاف رائے رہا ہے، اس میں توسع اور ولی اللہی طرز فکر کی پیروی۔
- مخالف نقطۂ نظر کے مقابلہ تحمل، اختلاف رائے کے باوجود احترام اور ملت کے مشترکہ مسائل کے لئے اشتراک۔
- علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ تزکیہ واحسان کی جامعیت۔
- برادرانِ وطن میں دعوتِ دین اور دفاعِ اسلام کی طرف خصوصی توجہ۔
- زبان وبیان اور سلوک ورویہ میں اعتدال۔
- مناظرہ اور طنز وتشنیع کی بجائے نصح ومحبت کے ساتھ اصلاح ودعوت۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ العالی

RNI No: 1219775, RNI Tile-Code: APURD01946

Al-Alam Urdu Computers Hyd. +91 9959897621